ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

"خاص بچے" ایک خصوصی گوشہ

نظم

نابینا بچے کی نصیحت

خاص بچوں پر رنگین معلوماتی تصویری فیچرز

مارچ ۱۹۹۴ء

ایک فلسفی چوزے کی مزیدار کہانی

کرکٹ اسٹارز عید کیسے مناتے ہیں

ایک دل چسپ سروے

توتے کِس طرح باتیں کرتے ہیں

ایک دل چسپ مضمون

نجات

اشتیاق احمد کا سلسلہ وار سنسنی خیز ناول

ابّو بہت اچھے ہیں

خاص بچی راحت صلاح الدین کی کہانی اور انٹرویو

ایک پیاری

چیونٹی کا گیت

NUT CHOCOLATE
Milk Chocolate with Nuts
Paxy's
HACKS DROPS
HERO
HACKS
mentholated drops.
ORANGE CANDIES
real orange taste.
HERO
creamy milk chocolate
with rich coconut filling.
NUT CHOCOLATE
milk chocolate
full of nuts.
MOVE TO PAXY'S GALAXY OF SWEET STARS
Paxy's
SIND CHOCOLATE WORKS
Plot No. 11, K-28(C), University Road, Karachi-74800, Pakistan.
THAVER

ACTION
جونیئر کوئیز
ایکشن جونیئر برش کی خریداری پر
ہر ماہ بچوں کے لئے ہزاروں
انعامات
ACTION
ACTION
ایکشن جونیئر ٹوتھ برش خریدتے ہوئے دکاندار سے ایک کوئیز کوپن ضرور حاصل کیجئے۔
کوپن میں درج اپنے وطن کے بارے میں ۵ سوالوں کے صحیح جوابات دیجئے اور ہر ماہ ہزاروں کی تعداد میں
خوبصورت تحفے جیت لیجئے۔
جوابات کا کوپن آپ ہمیں پوسٹ کر دیں، یا اپنے پسندیدہ تحفے پر نشان لگا کر اپنے قریبی دکاندار
کے پاس جمع کرائیں۔
"پہلے آیئے، پہلے پایئے" کی بنیاد پر ہر ماہ موصول ہونے والے پہلے دو ہزار جوابات پر آپ کی اپنی پسند کے
قیمتی انعامات، آپ کے دروازے پر!
یونیورسل برش وَیر (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ESTD. 1947
UNIVERSAL
REGD. TRADE MARK
R-LINTAS

ارشادِ باری تعالیٰ

تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی،
اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمھارے
پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بُوڑھے ہو کر
رہیں تو اِنھیں اُف تک نہ کہو، نہ اِنھیں جھڑک کر
جواب دو، بلکہ اِن سے احترام کے ساتھ بات
کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ اِن کے سامنے جُھک کر
رہو اور دُعا کیا کرو کہ پروردگار اِن پر رحم فرما جس طرح
اِنھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن
میں پالا تھا۔

(بنی اسرائیل ۲۲ تا ۲۳)

عطیۂ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن

۷۔ حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی

۸۷ بلاک نمبر ۷، خانیوال

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

بچوں کی دنیا کا ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ آنکھ مچولی

جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۹

رمضان/شوال ۱۴۱۴ھ مارچ ۱۹۹۴ء

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی
منیجنگ ایڈیٹر
ایم اے فاروقی
مدیر اعزازی
طاہر مسعود
مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان
سرکولیشن مینجر
بابر فاروقی
مصوّر
مومن رحیم

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔
ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریریں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی دینی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے شائع کیا ہے۔

قیمت ۱۰ روپے
۷ درہم ۷ ریال

فون: ۴۹۴۲۸۵۷

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۔ پی آئی بی کالونی کراچی ۵ (۷۴۸۰۰)

ناشر: ظفر محمود شیخ - طابع: زاہد علی - مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

ان سے تعاون کیجیے
ان پر اعتماد کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے
ان اداروں
کو اپنا باقاعدہ
ایجنٹ
مقرر کیا
ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدر آباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	مُلتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۷۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولابخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی
خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کیلئے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط وکتابت کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف ― ۸

ماہِ رواں کی پہلی بات ― اداریہ ― ۹

حمد باری تعالیٰ (نظم) ― ریاض حسین قمر ― ۱۰

آئیے سچا روزہ رکھیں ― حماد خالد فیاضی ― ۱۱

ابّو بہت اچھے ہیں ― راحت صلاح الدین ― ۱۵

میرا نام راحت ہے ― محمد عمر احمد خان ― ۲۰

تم منصور ہو ― فاروق حسن چانڈیو ― ۲۵

ماہِ رمضان کی فضیلت (نظم) ― عبدالقادر ― ۲۹

آشیانے ― ادارہ ― ۳۰

معذور ڈاکٹر ― ذیشان بن صفدر ― ۳۲

مجھے معاف کر دینا ― عثمان بن سلیم ― ۳۸

لاریب فیہ (نظم) ― محمد جاوید خالد ― ۴۲

سہارے کی ضرورت ― احسان الحق حقانی ― ۴۳

سوال یہ ہے ― ایاز محمود ― ۴۸

کاش میں معذور نہ ہوتا ― خلیل جبار ― ۵۱

فیصلہ ― رئیس احمد مغل ― ۵۷

کھلاڑیوں کی عید ― سلیم خالق ― ۶۳

ہنستے ہنستے ― لطائف ― ۶۶

سب سے خاص بچی ― غلام حسین میمن ― ۷۰

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا ― ادارہ ― ۷۵

نابینا بچے کی نصیحت (نظم) ― محمد نوید مرزا ― ۷۸

وہ کیا راز تھا ― محمد عمر احمد خان ― ۷۹

عکس ادھورے کیجیے پورے ― ادارہ ― ۸۵

قیمتی لباس ― سیّد نظر زیدی ― ۸۸

سردی کی ہے بات (نظم) ― عباس عالم ― ۹۳

بنام آنکھ مچولی ― خطوں کے جواب ― ۹۴

فلسفی چوزہ ― محمد بن مالک ― ۹۹

توتے کس طرح باتیں کرتے ہیں؟ ― نگہت آرا چوہان ― ۱۰۴

مزید محنت کی ضرورت ہے ― ادارہ ― ۱۰۶

چیونٹی کا گیت (نظم) ― حفیظ الرحمٰن احسن ― ۱۰۷

بچاؤ ― اشتیاق احمد ― ۱۰۸

قلم دوست ― ننھی تحریریں ― ۱۱۵

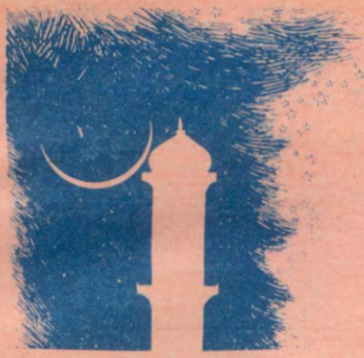

سنہرے حروف

ایک بار حضرت عمرؓ خانہ کعبہ کا طواف فرما رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بدّو کھڑا دُعا مانگ رہا ہے۔ "اے میرے پروردگار! تو مجھے اپنے قلیل بندوں میں سے بنا دے۔" یہ دُعا سن کر حضرت عمرؓ کو بہت تعجب ہوا۔ فرمایا "اس بدو کو بلا کر لاؤ۔" جب وہ شخص آیا تو امیرالمومنینؓ نے پوچھا "بھائی یہ تم کیا دُعا مانگ رہے تھے ایسی دُعا میں نے آج تک نہیں سنی..... تمہاری اس دُعا کا کیا مطلب ہے؟" بدو کچھ دیر رکا اور پھر بولا "حضرت آپ کو معلوم ہے۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ کو اور بھی حیرت ہوئی۔ فرمایا "کچھ تو بتاؤ مجھے کیا معلوم ہے!!"

بدو بولا! "امیرالمومنینؓ آپ خوب جانتے ہیں۔"

امیرالمومنینؓ کا اشتیاق بڑھتا رہا۔ بولے "میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا بتاؤ تو سہی؟"

بدو نے کہا۔ "کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا، کیا آپ کی نظر سے یہ آیت نہیں گزری۔ (وقلیل من عبادی الشکور) (اور میرے شکر گزار بندے بہت قلیل ہیں) میں اپنے رب سے دُعا کرتا ہوں کہ اے اللہ تو مجھے اپنے ان شکر گزار بندوں میں سے بنا دے جو بہت تھوڑے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ بہت مُتاثر ہوئے۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ "ہر شخص عمرؓ سے زیادہ جاننے والا ہے!" اور بہت دیر تک سر جھکائے سوچ میں ڈوبے رہے۔

ایم۔ اعجاز احمد

پہلی بات

صحت اللہ کا انعام ہے۔ خواہ صحت ذہنی ہو یا جسمانی۔ اس کی قدر و قیمت سے وہی واقف ہوتے ہیں جو اس سے محروم ہوتے ہیں۔ پس اگر ہم صحت مند ہیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور اس کے شکر ادا کرنے کا ایک اچھا طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ یعنی اللہ نے جو نعمت دی ہے اس کی حفاظت کریں۔ ہمارے ارد گرد بے شمار بچے ایسے ہیں جو مکمل جسمانی صحت نہیں رکھتے۔ وہ کسی نہ کسی طرح معذور ہیں۔ انہیں "خاص بچے" کا نام دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بچے ہم میں سے ہیں لیکن ہم سے زیادہ اہم ہیں، ہم سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہیں یہ نام دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اگر آپ نے ایسے بچوں کے حالات کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے تو آپ بخوبی جانتے ہوں گے کہ بعض اوقات ان بچوں کو خود ان کے اپنے گھروں میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، انہیں اہمیت نہیں دی جاتی یا پھر انہیں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہی درمیان کچھ احمق ایسے بھی ہیں جو ان بچوں کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ ان بچوں پر ترس کھاتے ہیں۔ یہ سارے رویئے صحیح نہیں۔ ان پیارے پیارے بچوں کو نہ نظر انداز کیا جانا چاہئے نہ ان کی توہین کرنی چاہئے اور نہ ان پر رحم کھانا چاہئے۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ ان کی معذوری کو ایک ناگوار حقیقت سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے اور ان بچوں کو اہمیت دینی چاہئے۔ اسی لئے انہیں "خاص بچے" کہا گیا ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم ان بچوں سے دوستی کریں، ان سے ملتے جلتے رہیں، انہیں تحفے تحائف دیں تاکہ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کریں۔ ہماری دل جوئی اور حوصلہ افزائی سے ان میں جینے کی امنگ پیدا ہوگی۔ انہیں زندگی آسان محسوس ہوگی۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف سمجھنا آہستہ آہستہ چھوڑ دیں گے۔

آپ یہ کبھی نہ بھولیں کہ خاص بچوں کی معذوری صرف ان ہی کے لئے امتحان نہیں ہے، خود ہماری انسان دوستی کے لئے بھی آزمائش ہے۔ انسانوں سے محبت کرنے کے زبانی دعوے تو سبھی کر لیتے ہیں کیونکہ یہ بہت آسان کام ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم اپنے اس دعوے کو ثابت بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ کو واقعی اللہ کی مخلوق سے پیار ہے تو پھر آپ کو عہد کرنا چاہئے کہ آپ کسی ایک خاص بچے کو اپنا دوست بنائیں گے۔ خواہ وہ آپ سے قریب رہتا ہو یا دور۔ آپ اس سے کسی نہ کسی طرح رابطہ قائم رکھیں گے، اس سے ملیں گے، اسے خط لکھیں گے۔ اسے پھولوں اور کھلونوں کے تحفے دیں گے۔ اللہ جسے ایک صلاحیت سے محروم کرتا ہے اس کے عوض میں بہت سی صلاحیتیں عطا بھی کر دیتا ہے۔ خاص بچے عام طور پر بڑی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، بس انہیں ذرا توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر دیکھئے وہ کس طرح اپنے آپ کو منواتے ہیں۔

آنکھ مچولی نے دعوہ اکادمی اور یونیسیف کی دعوت پر "خاص بچے" کے موضوع پر اس شمارے میں ایک گوشہ مخصوص کیا ہے۔ ہم پچھلے شمارے میں اعلان کر چکے ہیں کہ ہمارا یہ شمارہ کسی بھی مقابلے میں شریک نہیں ہے۔ یہ ایک ادنیٰ سی خدمت ہے جو ہم کسی انعام کی لالچ میں پڑے بغیر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس شمارے سے خاص بچوں کو کوئی فائدہ پہنچ جاتا ہے تو یہی ہمارا سب سے بڑا انعام ہوگا۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

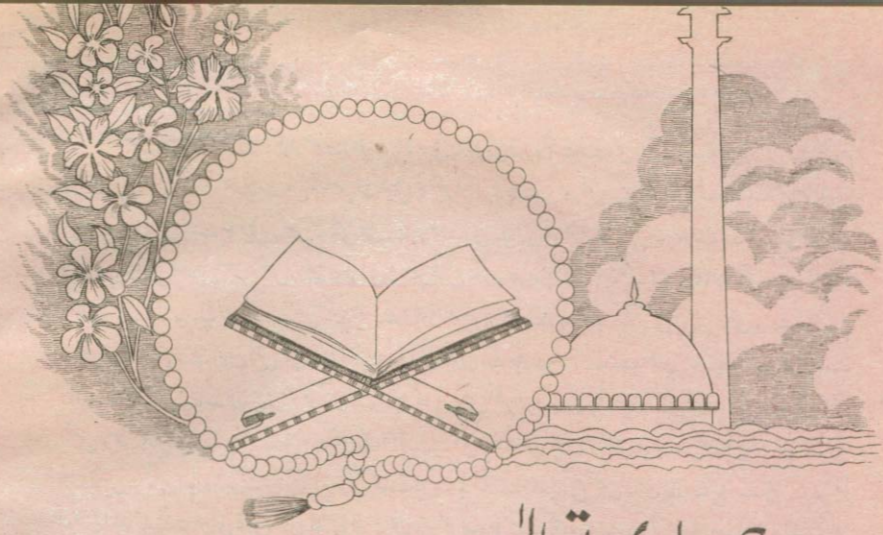

حمد باری تعالیٰ

ریاض حسین قمر

یہ اُڑتے بادل، برستی بارش یہ بہتا پانی
بزرگ و برتر خدا کی ہے ساری مہربانی
چمن میں پھولوں کے رنگ سارے بنائے اُس نے
فلک کے دامن میں چاند ستارے سجائے اُس نے
صبا کے جھونکوں کو ٹھنڈا ٹھنڈا بنا دیا ہے
سبھی پرندوں کو گیت گانا سِکھا دیا ہے
اُسی نے سورج کو زندگی کا امیں بنایا
اسی نے سر سبز مخملیں گھاس کو اُگایا
یہ پتھروں میں شجر اُگانا ہے کام اس کا
یہ موسموں کا بدل کے لانا ہے کام اس کا
کبھی ہے سردی کہ جس میں ذی روح کانپتے ہیں
کبھی ہے گرمی کہ جاندار اس میں ہانپتے ہیں
بلند و بالا پہاڑ اس نے بنا دیئے ہیں
پھر ان پہاڑوں سے اس نے چشمے بہا دیئے ہیں

آئیے سچا روزہ رکھیں

حماد خالد فیاضی

قدرت اللہ شہاب نے اپنی سوانح عمری "شہاب نامہ" میں ایک ایمان افروز واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہالینڈ میں ایک روز سیر سے واپسی پر میں ایک بینچ پر بیٹھا تو قریب سے ہی سورہ رحمٰن کی بڑی میٹھی تلاوت سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ ایک فرنچ کٹ سفید داڑھی والا ڈچ (ہالینڈ کا شہری) آنکھیں بند کئے جھوم جھوم کے تلاوت کر رہا ہے۔ وہ فارغ ہوا تو سلام کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ ڈچ مسلمان ہیں۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اور اپنا نام ڈی ہوگ بتایا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میرا وطن پاکستان ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اسلام کا تحفہ اسے کراچی میں نصیب ہوا تھا۔ پہلے وہ ایک کارگو شپ کا کپتان تھا۔ ایک بار اس کا جہاز کراچی کی بندر گاہ پہ کچھ سامان لدوانے کے لئے رکا۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور سامان لادنے والے مزدور پسینے سے شرابور تھے۔ جہاز کے عملے نے انہیں ٹھنڈا پانی دیا تو سب نے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ روزے سے ہیں۔ ایک بوڑھے مزدور پہ ڈی ہوگ کو بڑا ترس آیا جو گرمی حبس اور سامان کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ دوسروں کی نظر بچا کے وہ اس بوڑھے مزدور کو اپنے

کیبن میں لے گیا اور اسے ٹھنڈے جوس کا گلاس دے کر اشارے سے کہا کہ یہاں اسے کوئی نہیں دیکھ رہا اس لئے اس کو پی لو۔ بوڑھے مزدور نے نفی میں سر ہلایا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اللہ، اللہ کہتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔ ایک ان دیکھے خدا کی ذات پر اس قدر مکمل اور غیر متزلزل ایمان دیکھ کر ڈی ہوگ کے خیالات اور تصورات میں ہلچل مچ گئی اور آخر کچھ عرصے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔"

دیکھا آپ نے کہ ایک مسلمان کے خدا پر یقین کی قوت سے کس طرح ایک غیر مسلم اس حد تک متاثر ہوا کہ بالآخر وہ بھی خدا پہ ایمان لے آیا۔

ذرا غور کیجئے کہ روزہ کا مقصد کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے روزہ ہم پہ صرف اس لئے فرض کیا کہ ہم صبح سے شام تک بھوکے پیاسے رہیں اور افطار کے بعد اب جو چاہے کرتے پھریں یا زیادہ سے زیادہ روزہ کے دوران پانچ نمازیں اور ایک دو سپارے پڑھ ڈالے تو کیا روزہ کا حق ادا ہو گیا؟ آپ کے دل میں خود خیال آئے گا کہ روزہ کا اتنا سطحی مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دراصل روزہ، نماز اور دیگر تمام عبادات کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ ایک شخص کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اس کی پوری زندگی اللہ کی عبادت بن جائے۔ اس کا چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا غرض ہر عمل اللہ کی عبادت کہلائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب کہ ہم ان تمام عبادات کی اصل روح اور مقصد کو پہچان کے اس پر عمل نہیں شروع کر دیتے۔

روزے کی خاصیتیں:

روزے کے علاوہ باقی تمام عبادات میں ظاہری حرکات ہوتی ہیں مثلاً نماز میں رکوع اور سجدہ کیا جاتا ہے، حج میں ہزاروں آدمیوں کے ساتھ ایک لمبا سفر طے کیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ بھی ایک شخص لیتا ہے اور دوسرا دیتا ہے۔ گویا ان سب کا حال چھپ نہیں سکتا۔ لیکن روزے کا حال صرف خدا اور بندے کے درمیان رہتا ہے۔ ایک شخص سب کے ساتھ سحری کھائے اور افطار کے وقت تک دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے لیکن چھپ چھپا کے پانی پی لے یا کچھ کھا لے تو کسی کو خبر نہیں ہو سکے گی۔ لیکن جو شخص حقیقت میں روزہ رکھتا ہے اور چوری چھپے بھی کچھ نہیں کھاتا پیتا، سخت بھوک اور پیاس کی حالت میں بھی کچھ کھانے پینے کا خیال تک دل میں نہیں لاتا ذرا سوچئے کہ اس کا اللہ تعالیٰ پہ کس قدر زبردست یقین ہے۔ کتنا خوفِ خدا ہے اس کے دل میں کہ بھوک پیاس کی تکلیف اٹھا لیتا ہے لیکن اللہ کے ڈر سے کچھ کھاتا نہیں کچھ پیتا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی خفیہ حرکت ساری دنیا سے چھپ سکتی ہے لیکن اللہ سے تو نہیں چھپ سکتی۔ اس طرح جتنا وہ آزمائش میں پورا اترتا ہے اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔

روزے کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ یہ مسلسل ایک ماہ کے لے نافذ ہوتا ہے۔ نماز کی مدت چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ سال میں ایک

دفعہ فرض ہے اور حج زندگی میں ایک مرتبہ، وہ بھی اگر استطاعت ہو تو۔ اس کے برعکس روزہ وہ واحد عبادت ہے جو ایک مہینے تک مسلمانوں کی فوجی انداز میں ٹریننگ کرتا ہے۔ صبح سحری کے لئے اٹھو فلاں وقت پہ کھانا پینا بند کر دو، دن بھر میں یہ کام کر سکتے ہو اور فلاں فلاں کام نہیں کر سکتے۔ شام کو ٹھیک وقت پہ افطار کرو اور پھر تراویح کے لئے دوڑو۔ اس طرح صبح سے شام تک ایک فوجی کی طرح ٹریننگ دی جاتی ہے۔ پھر گیارہ ماہ کے لئے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جو تربیت ایک ماہ میں دی گئی ہے اس کے اثرات عام زندگی میں ظاہر ہوں اور جو کمی باقی رہ جاتی ہے وہ اگلے سال کی ٹریننگ میں دور کی جاتی ہے۔

رمضان کے دوران ہر طرف نیکی اور پرہیز گاری کا دور دورہ ہوتا ہے۔ جہاں جائیں ہر شخص حکم خداوندی کی تعمیل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ روزہ نہ رکھنے والے بھی اپنی اس حرکت پر اتنے شرمندہ ہوتے ہیں کہ دوسروں سے چھپ کر کھاتے پیتے ہیں۔ ہر ایک گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں نیکی اور تقویٰ کا عام ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "آدمی کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔ ایک نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک پھلتی پھولتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ روزہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ خاص میرے لئے ہے اور میں اس کا جتنا چاہوں اجر دیتا ہوں۔"

یعنی اگر اسکول جاتے ہوئے آپ نے رستے میں پڑی اینٹ اس خیال سے ہٹا دی کہ کہیں کوئی ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے یا کسی نابینا کو سڑک پار کرا دی یا کوئی اور نیک کام کیا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کو اس نیکی کا اجر صرف اتنا ہی نہیں ملے گا بلکہ اس سے بڑھ کر ملے گا اور یہ اجر سات سو گنا تک بڑھ سکتا ہے۔ خدا کا یہ کرم ہی ہم گناہ گاروں پہ کیا کم تھا کہ کہاں یہ شان کریمی کہ روزے کو خدا نے صرف اپنے لئے مخصوص فرما لیا۔ گویا جتنی زیادہ نیک نیتی سے ہم اس ماہ میں روزے رکھیں گے۔ جتنے زیادہ نیک اعمال کریں گے اور پھر باقی گیارہ ماہ میں جس قدر روزے کے اثرات ظاہر ہوں گے اتنا ہی زیادہ خدا کے ہاں اس کا بدلہ ملے گا اور اتنا ملے گا جس کی کوئی انتہا نہیں۔

بے اثر روزے

روزوں کا جو اثر ہماری زندگیوں اور ہمارے معاشرے پر ہونا چاہئے تھا وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا۔ ظاہر ہے یہ روزوں کا قصور نہیں۔ بلکہ ضرور کہیں ہم ہی غلطی کر گزرتے ہیں اور ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم نے نماز اور روزے کی ظاہری صورت کو ہی عبادت سمجھ لیا ہے اور ان عبادات کے اصل مقصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم سمجھتے ہیں جو شخص صبح سے شام تک کچھ نہ کھائے پیئے وہ روزہ سے ہے چاہے کہ دن بھر پڑا سوتا رہے یا ٹی وی

دیکھتا رہے۔ اب بھلا خود ہی بتایئے کہ اس قسم کے روزوں کا ہم پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو رمضان میں خاص طور پر نمازیں پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ دن بھر میں تین چار سپارے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ یہ لوگ ان سے تو یقیناً بہتر ہیں جو سوئے رہتے ہیں یا وقت گزاری کے لئے ٹی وی دیکھتے ہیں لیکن یہ لوگ بھی روزہ کے اصل مقصد سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ قرآن پاک کی تلاوت کو ہی عبادت تصور کرتے ہیں اور اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے بھلا خود سوچئے کہ اگر ایک آدمی ڈاکٹر کے نسخے کو زبانی رٹتا رہے تو کیا اس کی بیماری دور ہو جائے گی؟ بیماری بھگانے کا تو ایک ہی طریقہ ہے کہ ڈاکٹر کے نسخے کے مطابق دوا استعمال کی جائے۔ یہی معاملہ قرآن کریم کی تلاوت کا ہے۔ قرآن کریم انسانوں کی نجات کا ایک عظیم نسخہ ہے۔ اس نسخے پر عمل ہی ہمیں برائیوں سے بچا سکتا ہے۔ قرآن کو بغیر سمجھے پڑھنے سے ثواب تو یقیناً ہو گا کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے لیکن اس کا صحیح معنوں میں فائدہ اس وقت پہنچے گا جب ہم اس کو سمجھ کر پڑھیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ روزے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہمیں غریبوں کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بھوک کی تکلیف کیا ہوتی ہے اور فاقہ کسے کہتے ہیں۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بھوکے کو کھانا کھلانا باعث ثواب کیوں ہے اور محتاجوں کی مدد کیوں کرنی چاہئے۔

روزہ کا اصل مقصد

صبح سے شام تک بھوک پیاس برداشت کرنے کا اصل مقصد انسان کے اندر خوفِ خدا پیدا کرنا ہے، اتنی طاقت پیدا کرنا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے مطابق کام کر سکے۔ رمضان میں تو بجا طور پر یہ قوت کسی حد تک ہمارے اندر پیدا ہو جاتی ہے یعنی ہم سحری سے افطار تک ہر حلال چیز سے بھی ہاتھ کھینچ لیتے ہیں کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے لیکن خدا کا یہ خوف صرف رمضان تک ہی محدود کیوں رہتا ہے۔ باقی مہینوں میں ہم جھوٹ بولتے ہیں، غیبت کرتے ہیں، دھوکا دہی اور دنگا فساد بپا کرتے ہیں، دوسروں کا حق مارتے ہیں، رشوت دیتے اور لیتے ہیں۔ کیا اس وقت ہمیں خدا کے حکم کا پتہ نہیں ہوتا۔ یقیناً ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ، غیبت اور رشوت کے بارے میں خدا کے کیا احکامات ہیں لیکن ہمارے اندر خدا کا خوف نہیں ہوتا، اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ ہم خدا کی مرضی اور رضا کے مطابق عمل کر سکیں۔ پس رمضان میں اور رمضان کے بعد اگر آپ میں اتنی قوت پیدا ہو جائے کہ آپ خدا کے احکامات پہ بے دھڑک عمل کر سکیں، چاہے اس سے آپ کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچ رہا ہو، تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے روزہ کا مقصد پا لیا اور یہی وہ روزہ ہے جس کی ترقی کی خدا کے ہاں کوئی حد نہیں، کوئی انتہا نہیں۔

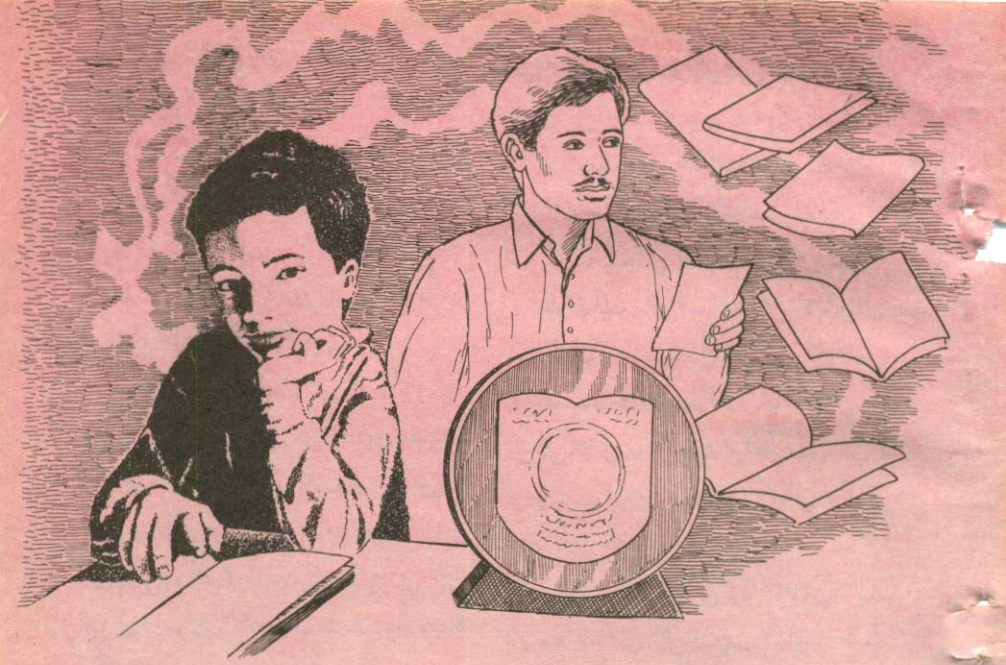

ابّو بہت اچھے ہیں

راحت صلاح الدین

پیارے ابو جان،

میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ساتویں جماعت میں داخل ہونا چاہتا ہوں اس لئے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے آپ میری خواہش ضرور پوری کریں گے۔

آپ کا بیٹا

حارث

نفیس سی ہینڈ رائٹنگ میں لیک پرچے پر یہ عبارت درج تھی جو داؤد صاحب کو اپنے بستر کے سرہانے پڑی ملی تھی۔ جسے پڑھنے کے بعد داؤد صاحب نے وہ پرچہ بیزاری سے نیچے پھینک دیا۔ انہیں اپنے بیٹے حارث کی اس خواہش کا علم تھا تو سہی مگر وہ اسے تعلیم دلوانے کے زیادہ حق میں نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "خاص بچوں" کو زیادہ تعلیم نہیں دلوانی چاہئے کہ اس جھنجھٹ میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ حارث کا شمار بدقسمتی

سے ایسے ہی "خاص بچوں" میں تھا۔ لیکن اس نے کبھی اپنی محرومی کا غم نہ کیا تھا۔ حارث اب تک جو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوا تھا اس کی وجہ اس کی والدہ تھیں جو اس کی پڑھائی کے لئے ابو سے کتنی بار لڑی جھگڑی تھیں۔

حارث ایک ذہین لڑکا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر میں لڑائی جھگڑے کی فضا قائم ہو۔

حارث کے اور بھی بھائی بہن تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی حارث کی طرح بولنے کی صلاحیت سے محروم نہ تھا۔ شارق، غالب اور درخشاں۔ تینوں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح سے صحت مند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حارث کے مقابلے میں انہیں ابو سے زیادہ پیار ملتا تھا حالانکہ حارث زیادہ توجہ کا مستحق تھا۔ داؤد صاحب سمجھتے تھے کہ حارث پر روپیہ اور وقت صرف کرنا فضول ہے۔

امی اور ابو کے آئے دن کے جھگڑوں نے حارث کو بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ اتنا حساس کہ جو باتیں اس کے سوچنے کی نہیں تھیں ان باتوں پر بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ تعلیم حاصل کرنے کا اسے بہت شوق تھا۔ بچپن میں جب وہ محض ڈھائی تین سال کا بچہ ہی تھا تو جو کتاب بھی حارث کے ہاتھ لگ جاتی، وہ اسے گھنٹوں دیکھتا رہتا۔ حارث کی والدہ نے اپنے بچے کی کتاب سے جب محبت دیکھی تو انہوں نے اسی دن سے حارث کو پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اور اب چھ جماعتیں پڑھنے کے بعد حارث اپنے ابو کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس نے ابو جان کے نام چھوٹا سا خط لکھ کر ان کے بیڈ پر رکھ دیا تھا ایک موہوم امید کے ساتھ، لیکن داؤد صاحب نے اس چھوٹے سے خط کو نظر انداز کر کے جیسے اس کا ننھا سا دل توڑ دیا تھا۔

حارث ایک سال تک پڑھ نہیں سکا لیکن اس کے مطالعے کی عادت چھوٹی نہیں تھی۔ اپنی حساس طبیعت کے باعث اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے دل میں لکھنے کی خواہش بار بار سر اٹھاتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ سوچتا، محسوس کرتا ہے اسے صفحہ پر منتقل کر دے۔

بہت ڈرتے ڈرتے اس نے "احساس" کے نام سے ایک کہانی لکھی اور بچوں کے ایک رسالے میں بھیج دی۔ اس کی پہلی ہی کہانی نہ صرف رسالے میں چھپ گئی بلکہ ایڈیٹر صاحب نے اس کہانی کو بے حد پسند کیا اور اس سے ایسی ہی دلچسپ اور مزے دار کہانیاں لکھنے کی مزید فرمائش کی۔

ایک ہی سال کے قلیل عرصے میں حارث کی کئی کہانیاں بچوں کے مختلف اخبار و رسائل میں چھپیں اور بے حد پسند کی گئیں۔

یہ بات داؤد صاحب کو بھی پتہ چل گئی تھی کہ حارث کہانیاں لکھنے لگا ہے لیکن انہوں نے کبھی حارث کی کوئی کہانی پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیوں کہ انہیں مطالعے کا قطعاً شوق نہ تھا۔ وہ زیادہ وقت اپنے کاروبار پر صرف کرتے تھے۔ ان کی بیگم ہی حارث پر توجہ دیتی تھیں۔ لیکن آج ڈاک سے

جو خط آیا تھا اسے پڑھ کر وہ چونک اٹھے تھے۔

خط حارث کے نام تھا اور اس میں لکھا تھا کہ حارث کو صوبائی سطح پر "بچوں کا بہترین ادیب" تسلیم کرتے ہوئے دس ہزار روپے کے نقد انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے اور یہ انعام ایک بڑی تقریب میں دیا جائے گا جس میں صوبے کے وزیرِ اعلیٰ انعامات تقسیم کریں گے۔

داؤد صاحب حیرانی سے خط کو دیکھ رہے تھے انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ چھٹی جماعت کا ایک بچہ اتنا بڑا انعام حاصل کر سکتا ہے۔ "کیا واقعی حارث بہت اچھا لکھتا ہے؟" انہوں نے سوچا اور پھر انہوں نے مختلف رسالوں میں چھپنے والی حارث کی چند ایک کہانیوں کا مطالعہ کیا تو ہل کر رہ گئے۔

حارث کی تقریباً ہر کہانی کا مرکزی کردار والدین تھے جن میں ہر ابو کو اس نے ہیرو بنا کر پیش کیا تھا جو اپنے بچوں کی خوشیوں اور خواہشات کا بے حد احترام کرتے دکھائے گئے تھے اور جو کبھی آپس میں لڑتے نہیں تھے۔ حالانکہ داؤد صاحب اپنی بیگم سے لڑتے بھی تھے اور پھر انہوں نے حارث کی آگے پڑھنے کی خواہش کا احترام بھی نہیں کیا تھا۔

حارث کی کہانیاں پڑھ کر داؤد صاحب بے حد شرمندہ ہوئے۔ ان کی ایک کاروباری میٹنگ تھی جس میں انہیں پہنچنا تھا پھر وہ حارث سے شرمندگی کے سبب سامنا نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حارث کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں انہوں نے اسے انعام کی مبارک باد دی اور آگے لکھا:

مجھے معاف کر دینا حارث بیٹے! میں غلط سمجھا تھا کہ تم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ تم نے اتنی کم عمری میں اتنا بڑا انعام حاصل کر لیا۔ میں کل ہی تمہیں اسکول لے جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا پیارا بیٹا مجھے معاف کر دے گا۔

تمہارے گناہ گار
ابّو

وہ یہ رقعہ حارث کے کمرے میں رکھ کر دفتر چلے گئے اور پھر..... دفتری کاموں سے رات گیارہ بجے فارغ ہو کر گھر آئے تو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دیکھا کہ حارث بیڈ پر ان کا انتظار کرتے کرتے سو گیا ہے۔ وہ آگے بڑھے اور حارث کو گود میں اٹھا کر پیار کرنا ہی چاہتے تھے کہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ حارث کی مٹھی میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے حارث کی مٹھی کھولی، ایک سفید رقعہ ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ جلدی جلدی پڑھنے لگے۔

نفیس سی ہینڈ رائٹنگ میں حارث نے لکھا تھا۔

پیارے ابو جان!

پلیز! آپ مجھ سے معافی نہ مانگیں اگر آپ ایک سال کے لئے میری تعلیم نہ چھڑواتے تو شاید میں کبھی اتنی اچھی کہانیاں نہ لکھ پاتا۔ آپ تو میرے محسن ہیں۔ آپ ہی کی وجہ سے میں آج اس مقام پر پہنچا ہوں۔ آپ تو بہت اچھے

ہیں!!!

آپ کا بیٹا

حارث

یہ تحریر پڑھ کر کئی آنسو داؤد صاحب کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ حارث کے دل میں ان کے لئے اتنا عزت و احترام موجود ہوگا۔ حالانکہ وہ اسے ہمیشہ نظر انداز کرتے چلے آئے تھے۔ داؤد صاحب تیزی سے آگے بڑھے اور بے اختیار سوئے ہوئے حارث کا منہ چومنے لگے۔

○ ..... ○

مٹی کے تیل کا بدل ۔ درخت۔

فلپائن میں پایا جانے والا ایک درخت مٹی کا تیل کا بدل سمجھا گیا ہے کیوں کہ اس کی لکڑی بالکل مٹی کے تیل کی طرح جلتی ہے۔ ماہرین نباتات کے مطابق یہ درخت کسی بھی موسم اور دنیا کے کسی بھی خطے میں اگایا جا سکتا ہے۔

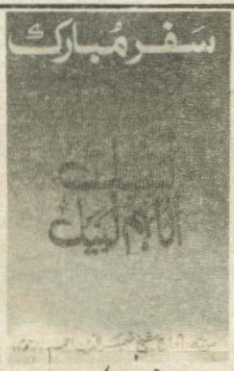

عازمینِ حج

متوجّہ ہوں

خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اللہ نے حجازِ مقدّس کے سفر کے لیے منتخب کر لیا۔

اِس سال فریضۂ حج کی ادائیگی پر جانے والے تمام حجّاج کی خدمت میں ضمیر الدّین میموریل آرگنائزیشن ایک ایسا تحفہ پیش کر رہی ہے جو سفرِ حج اور مناسکِ حج کے دوران اُن کے لیے بہترین راہنما ثابت ہو گا۔

جناب شیخ ضمیر الدّین احمد (مرحوم) کی تالیف کردہ کتاب "سفرِ مبارک" بلا قیمت حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر ایک خط اپنی حج کی دستاویزات کی فوٹو کاپی کے ساتھ، ارسال کیجیے۔ ہم یہ کتاب آپ کو ارسال کر دیں گے۔

پتا: ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن، 1۔ پی آئی بی کالونی، کراچی۔ پوسٹ کوڈ 74800

معذور سہی مجبور نہیں

اسکیٹنگ میرا شوق ہے

روز میری اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاتے ہوئے

کچن کے کاموں میں منہمک ۔۔ روز میری

ابو کے ساتھ سیر اور گفتگو کرتے ہوئے

روز میری بھی کیا کمال کی بچی ہے۔ بظاہر تو وہ آدھے جسم کی مالک ہے لیکن اس کی ہمت جوان ہے۔ جوانوں سے زیادہ جوان۔ کار ڈرائیونگ اس کا بہت بڑا خواب تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ کبھی کار ڈرائیو نہیں کر سکتی ـــــ ایک دن وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ ایک نمائش میں گئی۔ وہاں ایک کار بھی رکھی ہوئی تھی۔ ڈیڈی نے پوچھا:

"کیا تم کار رکھنا پسند کرو گی؟"

روز میری نے اپنی پہیے والی گاڑی پر بیٹھے بیٹھے کہا: "ڈیڈی! آپ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ میں کار نہیں چلا سکتی۔"

نمائش سے واپس آنے کے بعد ڈیڈی خاموشی سے گئے اور کار خرید لائے۔ پھر اس کار میں تکنیکی تبدیلیاں کی گئیں اور اس کا سارا نظام اس طرح کر دیا گیا کہ گاڑی کو صرف ہاتھوں سے کنٹرول کیا جا سکتا ہو۔ یہ ڈیڈی کا اس کی سولہویں سالگرہ کا سب سے قیمتی اور خوبصورت تحفہ تھا یوں تو روز میری اپنے سارے کام خود ہی کر لیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ کچن میں مزے سے کھانا بھی بنا سکتی ہے۔ لیکن اسے سب سے زیادہ خوشی کار ڈرائیونگ سیکھنے سے حاصل ہوئی۔ اب وہ بھاگ سکتی ہے، تیز، بہت تیز اور اسے لمحے بھر کو بھی خیال نہیں آتا کہ وہ تو معذور ہے۔ آدھے جسم سے محروم ہے۔

روز میری باکمال بچی ہے۔

ہمیں اس کی ہمت اور حوصلے سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔

میرا نام راحت ہے

باعزم، باہمت اور حوصلوں کی جیتی جاگتی تصویر "قیمتی تحفہ" کی ننھی منی مصنفہ راحت صلاح الدین سے ایک ملاقات

ملاقات: محمد عمر احمد خان

راحت صلاح الدین سے آپ خوب اچھی طرح واقف ہوں گے۔ مختلف رسالوں میں ان کی خوبصورت کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ان کا شمار "خاص بچوں" میں ہوتا ہے۔ بلکہ ان کی دو بہنیں عالیہ صلاح الدین اور سعدیہ صلاح الدین بھی راحت کی طرح خاص بچوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ راحت اور ان کی دونوں بہنیں چل پھر نہیں سکتیں، بول نہیں سکتیں، ان کی امی جان نادرہ صلاح الدین اور نانی جان نے ہمیں بتایا کہ ان کی تینوں بچیاں پیدائش ہی سے چلنے پھرنے اور بولنے سے معذور ہیں۔ ان کی معذوری پانچویں جماعت کے بعد زیادہ بڑھ گئی تو انہوں نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ اب یہ تینوں بہنیں گھر بیٹھ کر ریڈیو سنتی، ٹی وی دیکھتی، ویڈیو گیم کھیلتی اور رسالے پڑھتی ہیں یا پھر

راحت اپنی بہنوں میں سے سب سے چھوٹی ہیں۔ ذہنی طور پر تینوں بہنیں نہ صرف صحت مند ہیں بلکہ غیر معمولی طور پر ذہین ہیں۔ آپس میں ان سب کی گفتگو آنکھوں کے اشارے سے ہوتی ہے، جنہیں امی جان اور نانی جان کے علاوہ کوئی اور آسانی سے سمجھ نہیں سکتا۔

راحت کی بڑی بہن عالیہ صلاح الدین بھی خوب صورت کہانیاں لکھتی ہیں (عنقریب اپریل ۱۹۹۴ء میں آپ ان کی ایک مزے دار دلچسپ سی کہانی آنکھ مچولی میں پڑھ سکیں گے) سعدیہ کہانیاں تو نہیں لکھتیں البتہ اپنی بہنوں کی کہانیوں میں غلطیاں نکالتی ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی آپ کو بتاتے چلیں کہ راحت کو انٹرویو کے لئے جو سوالنامہ ہم نے بنا کر دیا تھا اس میں ان تینوں بہنوں نے تین غلطیاں نکال کر ہمیں بتائیں جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ تینوں بہنیں کتنی ذہین ہیں۔

راحت، عالیہ اور سعدیہ کے پیارے ابو صلاح الدین مرحوم بڑے قابل انجینئر اور نیک انسان تھے۔ وہ اپنی جوانی کے دنوں میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ابو کی شفقت سے محروم ہونے کے بعد ان بچیوں کی امی جان نادرہ صلاح الدین اور نانی جان نے اپنی پیاری بیٹیوں کو مایوسی اور مجبوریوں کے اندھیروں سے بچایا اور بلند ہمتی کے چراغ روشن کر دیئے۔ انہوں نے اپنی بے مثال شفقت، محبت، توجہ اور خدمت سے اپنی ان بچیوں کو کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

راحت اور ان کی بہنوں نے اپنے گھر کی چھوٹی سی دنیا میں اپنی پیاری امی اور نانی جان سے وہ تعلیم و تربیت پائی ہے جو عزم و ہمت کی لازوال داستان ہے ہم ان کی عظمت کو صرف سلام ہی کر سکتے ہیں۔

آنکھ مچولی کے لئے اس بار راحت صلاح الدین سے بات چیت کی گئی ہے۔ چونکہ راحت بول نہیں سکتیں اس لئے ہم نے یہ سوالات انہیں لکھ کر دیئے جس کا انہوں نے ہمیں تحریری جواب دیا۔

س: عام طور پر مُصنف کا ایک اچھا استاد ہوتا ہے جو اس کی غلطیوں کی نشاندہی کرتا رہتا ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کس نے کی؟

راحت: میرے اچھے استاد بچوں کے وہ رسالے ہیں جن کے مطالعے سے مجھ میں کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ میرے ابو (مرحوم) امی اور خاندان کے دیگر افراد نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

س: پہلی بار آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ لکھ سکتی ہیں؟

راحت: اسکول چھوڑنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں جو سوچتی ہوں اسے لکھنا بھی چاہئے چنانچہ میں نے لکھنا شروع کر دیا جو ابھی تک جاری ہے اور اب یہی میرا مشغلہ ہے۔

س: راحت! آپ کو یاد ہے کہ آپ نے پہلی کہانی جو لکھی اس کا کیا نام تھا اور وہ کس میگزین میں چھپی

تھی؟

راحت :جی ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پہلی کہانی جو میں نے لکھی اس کا نام تھا "عمارہ نے شرارت سے توبہ کر لی" اور وہ اخبار خواتین میں چھپی تھی۔

س :کہانیاں لکھتے وقت آپ کے ذہن میں مکمل خاکہ ہوتا ہے یا بس آپ بغیر سوچے سمجھے لکھنا شروع کر دیتی ہیں؟

راحت :خاکہ تو ذہن میں ہونا ضروری ہے ویسے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہانی لکھنے بیٹھتی ہوں تو انجام بعد میں سمجھ میں آتا ہے۔

س :راحت! ایک بات بتائیں مشغلے تو بہت سے ہیں جیسے تصویریں بیل بوٹے وغیرہ بنانا۔ آپ نے لکھنے ہی کو کیوں ترجیح دی؟

راحت :میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا ناں کہ مطالعے کا مجھے بے حد شوق ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار لکھ کر ہی کر سکتی ہوں اور میرے خیال میں ہر مشغلے میں انسان اپنے احساسات کا ہی اظہار کرتا نظر آتا ہے۔

س :راحت! آپ سیما صدیقی باجی کو تو جانتی ہیں جن کی شوخ و شریر تحریریں آنکھ مچولی میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں جب ہم آپ سے انٹرویو کے سلسلے میں آ رہے تھے تو سیما باجی نے کہا تھا کہ راحت سے یہ سوال بھی پوچھئے گا کہ وہ دو تین صفحات کتنے دن میں لکھ لیتی ہیں؟ تو آپ ہمارے قارئین کو اس بارے میں کچھ بتائیں!

راحت :دو تین صفحے لکھنے میں مجھے کم از کم دس پندرہ دن لگ جاتے ہیں ورنہ زیادہ سستی چڑھ جائے تو مہینہ ڈیڑھ مہینہ لازماً لگ جاتا ہے۔

س :چلیں! پھر تو آپ سیما باجی کی طرح سست نہیں۔ انہیں تو پورے ایک سو پچاس دن ہو گئے، ایک صفحہ نہیں لکھ سکی ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ کس قسم کی کہانیاں پڑھنا اور کس طرح کی کہانیاں لکھنا آپ کو زیادہ پسند ہے؟

راحت :معاشرتی مسائل پر کہانیاں پڑھنا اچھا لگتا ہے چنانچہ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں بھی ان ہی مسائل کے حوالے سے کہانیاں تخلیق کروں۔

س :راحت! آپ کو اپنی کہانیوں کے مجموعے "قیمتی تحفہ" پر "چیف منسٹر ایوارڈ" بھی مل چکا ہے غالباً ۱۹۹۰ء میں۔ آپ کی کتاب کو "پہلا انعام" جو ملا تھا اس کی مالیت کیا تھی؟ کچھ یاد ہے آپ کو؟

راحت :اپنی کتاب "قیمتی تحفہ" پر جو "چیف منسٹر ایوارڈ" ملا تھا اس میں ملنے والی رقم کی مالیت گو دس ہزار بتائی گئی تھی مگر سات ہزار ملے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس مقابلے کی کوئی سند نہیں دی گئی کہ ریکارڈ میں ہوتا کس سن میں کس کو کیا انعام دیا گیا۔

س :راحت یہ تو واقعی افسوس کی بات ہے ..... آپ کی اس بات کو ہم ریکارڈ میں لائیں گے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کی کتاب "قیمتی تحفہ" جو

گورنمنٹ اسکول برائے بہرے اطفال بہاولپور

بغداد الجدید روڈ پر واقع اس ادارے کا شمار خصوصی تعلیم کے قدیم اداروں میں ہوتا ہے یہاں قوت سماعت و گویائی سے محروم اور متاثرہ سماعت بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ متاثرہ سماعت بچوں کے کان چیک کرنے کی سہولت بھی دستیاب ہے۔ اس اسکول میں بھی تعلیم بالکل مفت ہے۔ چوہدری محمد زمان اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

مہران اسپیشل ایجوکیشن سینٹر، میرپور خاص سندھ

ڈائریکٹوریٹ جنرل برائے خصوصی تعلیم حکومت پاکستان کے تحت سٹلائٹ ٹاؤن میرپور خاص میں ایک ادارہ مہران اسپیشل ایجوکیشن سینٹر کے نام سے ستمبر ۱۹۸۷ء سے کام کر رہا ہے۔ یہاں ۵ سے ۱۲ سال تک کی عمر کے ایسے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے جو قوت سماعت و بصارت سے محروم ہیں۔ بصارت سے محروم طلبہ کے لئے بریل سسٹم اختیار کیا جاتا ہے جبکہ سماعت سے محروم طلبہ کے لئے اسپیچ تھراپی اور اشاروں کی زبان سے واقفیت کا خصوصی انتظام ہے۔ ساتھ ہی عام نصاب تعلیم بھی رائج ہے۔ طلبہ کو میڈیکل، ٹرانسپورٹ، لائبریری، یونیفارم کی سہولتیں حاصل ہیں۔ ادارے کی طرف سے وقتاً فوقتاً تعلیمی دوروں اور پکنک کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اس سینٹر کے تحت یونیسف کے تعاون سے میرپور خاص کے علاوہ دیگر گاؤں میں خصوصی بچوں کی تربیت کے لئے سی بی آر پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

المکتوم سینٹر۔ اسلام آباد

وفاقی حکومت کے زیر انتظام بصارت سے محروم بچوں کی بحالی کا ادارہ المکتوم سینٹر سیکٹر نمبر جی سیون ٹو میں واقع ہے۔ یہاں نرسری سے پانچویں جماعت تک بریل سسٹم کے ذریعے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ بڑی کلاسوں تک تعلیم دینے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔ اس وقت ادارے میں ساٹھ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ درسی تعلیم کے علاوہ طلبہ کو معمولات زندگی کو سمجھنے اور ان سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں جن میں دستکاری میوزک، موٹر ٹکنیک وغیرہ سر فہرست ہیں۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے، تاکہ وہ معاشرے کے ایک بہتر فرد کے طور پر زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ ادارے میں مختلف شعبہ جات کے ماہرین بچوں کو زیور تعلیمی سے آراستہ کرتے ہیں۔ گاہے گاہے تعلیمی دوروں اور پکنک کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ تاکہ طلبہ مختلف آوازوں اور مختلف ماحول کے فرق سے آگاہ ہو سکیں۔ طلبہ کو ٹرانسپورٹ اور لائبریری کی سہولت بھی حاصل ہے۔

○ ..... ○

آشیانے

پاکستان میں خاص بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مختلف ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے چند اہم اداروں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ فار دی بلائنڈ، بہاولپور

یہ ادارہ گذشتہ نصف صدی سے بصارت سے محروم بچوں کو تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنے کا مقصد فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اس ادارہ میں کے جی سے لے کر دسویں جماعت تک تعلیم کے علاوہ بصارت سے محروم طلبہ کو موسیقی اور دستکاری کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ یہاں پر تمام تر تعلیم حکومت پنجاب کی طرف سے مفت دی جاتی ہے۔ ہاسٹل میں بھی تمام سہولیات بلامعاوضہ فراہم کی جاتی ہیں۔ ماڈل ٹاؤن اے میں واقع اس خصوصی تعلیم کے ادارے میں اس وقت زیر تعلیم بصارت سے محروم بچوں کی تعداد ۴۰ کے قریب ہے۔ سلطان محمد مرزا اس ادارہ کے پرنسپل ہیں۔ اس ادارہ کے ساتھ ہی ایک ورکشاپ قائم ہے جس میں بصارت سے محروم ۲۰ ہنرمند کرسیاں بننے اور چک وغیرہ بنانے کا کام کرتے ہیں۔ یہ ہنرمند باقاعدہ گورنمنٹ ملازم ہیں۔

گورنمنٹ بریل پرنٹنگ پریس بہاولپور

پنجاب بھر میں بصارت سے محروم طلبہ کے اداروں کو بریل کتب کی فراہمی کا واحد ادارہ ہے۔ یہاں جدید نصاب کے مطابق درسی کتب (انک پرنٹ) سے بریل میں منتقل کی جاتی ہیں۔ سید منیر احمد بخاری اس پریس کے منیجر ہیں۔

شرط ضروری نہیں۔ شرط صرف "معیار" کی ہونی چاہئے۔

س: کھیلوں پر کوئی سوال ہو جائے ...... آپ یہ بتایئے کہ کھیلوں میں کون سا کھیل آپ کو زیادہ پسند ہے؟

راحت: ہاکی ...... جو قومی کھیل بھی ہے اور پھر اس میں ہار جیت کا فیصلہ جلد ہو جاتا ہے۔

س: اچھا آپ گھر پر کون کون سے کھیل کھیل لیتی ہیں؟

راحت: "چائنیز فرینڈ" بچپن میں بہت کھیلا کرتی تھی پھر "واچ اینڈ گیم" بھی کھیلا ہے مگر اب میرا پورا وقت اپنے شوق کی تکمیل میں گزر جاتا ہے یعنی رسائل کے مطالعے میں۔

س: رسائل کے مطالعے سے ایک سوال ہمارے ذہن میں آیا ہے کہ اچھا لکھنے کے لئے کیا مطالعہ بہت ضروری ہے؟

راحت: جی ہاں! جو جتنا زیادہ مطالعہ کرے گا اپنی بات کو اتنے ہی اچھے انداز میں کہہ سکے گا۔ اچھا لکھنے کے لئے اچھی کتابوں کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔

س: اچھا بھئی! کبھی آپ کو غصہ آیا، کن باتوں پر آتا ہے؟

راحت: غصہ تو اسلام میں حرام ہے لیکن انسانی کمزوریوں کی وجہ سے کبھی کبھی غصہ مجھے بھی آ جاتا ہے جب میری طبیعت کے خلاف کوئی بات ہو جاتی ہے۔ کبھی ایسے موقعوں پر میری آنکھوں میں آنسو

تین پتوں والا پودا

جنوبی افریقہ میں پیدا ہونے والا ویل حیثیتا دنیا کا عجیب و غریب پودا صرف ایک فٹ بلند ہوتا ہے اور تقریباً ۱۵ فٹ کے گھیرے میں زمین پر پھیلا ہوا ہوتا ہے اس پر صرف تین پتے آتے ہیں جو پودے کی پوری زندگی قائم رہتے ہیں۔ اس پودے کی زندگی ایک سو سال تک ہوتی ہے۔

بھی آ جاتے ہیں اور میں رو پڑتی ہوں۔

س: بھئی! یہ رونا دھونا تو اچھی بات نہیں آپ تو ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں اب آپ یہ بتایئے کس طرح کے لوگ آپ کو زیادہ اچھے لگتے ہیں؟

راحت: ایسے لوگ جو مخلص اور ملنسار ہوں، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

س: اچھا راحت! آپ آنکھ مچولی کے قارئین سے کچھ کہنا چاہیں گی؟

راحت: سب سے پہلے تو میں آنکھ مچولی کے قارئین اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جو مجھ سے محبت کرتے ہیں اور اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھتے ہیں پھر یہ کہوں گی کہ اپنی کسی بھی کمزوری کو زندگی کی راہ کی رکاوٹ نہ بننے دیجئے۔ بلکہ اسے نظر انداز کر کے تعلیم کے حصول کی کوششیں جاری رکھئے اور مطالعے کی عادت ڈالئے کہ تعلیم اور مطالعے سے نہ صرف ذہن میں بلکہ شخصیت میں بھی خوشگوار تبدیلی آتی ہے۔

چھپی اس میں سب سے زیادہ تعاون کس نے کیا؟

راحت: میری کتاب جو ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی اس میں سب سے زیادہ تعاون پبلشر نے کیا تھا۔

س: ادیبوں کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہ اچھا لکھتے ہیں لیکن اتنے اچھے ہوتے نہیں تو کیا اچھا ادیب بننے کے لئے اچھا انسان ہونا شرط ہے؟

راحت: اچھا ادیب اگر اچھے اخلاق و کردار کا مالک ہو تو سونے پہ سہاگے والی بات ہوتی ہے۔ میرے نزدیک ادیب کو اچھا انسان بھی ہونا چاہئے۔

س: راحت! آپ کے پسندیدہ مصنف کون کون سے ہیں؟ پسندیدگی کی وجہ بھی بتائیے؟

راحت: سچی بات تو یہ ہے کہ ہر اچھا لکھنے والا میرا پسندیدہ ادیب ہے کیوں کہ میرے خیال میں ہر لکھنے والا قلمی جہاد کرتا ہے اور جو تحریر پڑھنے کے بعد ذہن پر اچھا تاثر چھوڑ جائے تو وہ یقیناً قلمی جہاد میں شامل ہوتی ہے۔

س: آنکھ مچولی میں آپ کی کہانیاں اور خطوط بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے بہت سے لوگ آپ کے دوست بنیں ہوں گے اور یہ دوست امی جان کو پریشان کرتے ہوں گے جتنی بار آتے ہوں گے اتنی بار امی جان کو ان کے لئے چائے بنانا پڑتی ہوگی۔ آپ پریشان تو نہیں ہوتیں بہت سارے (چائے پینے والے) دوستوں سے؟

راحت: (ہنستے ہوئے) اچھے دوست بنانا ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے اور اچھے دوستوں سے دوستی کرنا میری آرزو ہے لیکن افسوس میری بہت گنی چنی دوست ہیں۔ میری سب سے اچھی اور بچپن کی ساتھی گڑیا (عتیقہ) ہے جو ہم تینوں بہنوں کی مشترکہ طور پر گہری دوست ہے۔ اس کے علاوہ ارم، ثمرین اور رابعہ بھی اچھی سہیلیوں میں سے ہیں۔

ادبی حلقوں میں شازیہ فرحین سے میری بہت اچھی اور گہری دوستی قائم ہو چکی ہے اور آپ کو یہ بات بتادوں کہ میری ان ساری سہیلیوں کی دوستی امی سے بھی ہے اس لئے امی کو ان کے لئے چائے بنانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو بڑے شوق سے بناتی ہیں۔

س: اچھا راحت! اب ٹی وی پر آجاتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ ٹی وی پر کون کون سے پروگرام آپ کو اچھے لگتے ہیں؟

راحت: اچھے اصلاحی کھیل اور مزاح سے بھرپور ڈرامے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ "طارق عزیز شو" بھی پسند ہے کہ اس پروگرام سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

س: اچھا یہ بھی بتائیے کہ ٹی وی پر بچوں کے پروگرام زیادہ ہونے چاہئیں یا بڑوں کے؟

راحت: اس سوال کے جواب میں تو میں یہ کہوں گی کہ ٹی وی پر دلچسپ پروگرام زیادہ سے زیادہ ہونے چاہئیں..... اب اس میں بچوں بڑوں کے پروگرام کی

تم منصور ہو

فاروق حسن چانڈیو

"امی جان دیکھئے! آج پھر میرے رنگ غائب ہیں۔" تیمور کا لہجہ شکایتی تھا۔

"ارے! تلاش کر لو..... تم خود ہی کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے؟" گلناز بیگم نے کہا۔

"میں کوئی بھولا وُولا نہیں ..... ضرور اس گونگے نے ہی اُٹھائے ہوں گے۔ اسے ہی بہت شوق ہے ڈرائنگ بنانے کا۔"

"پاگل ہو گیا ہے کیا..... وہ تو پہلے ہی تیرے کمرے میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے پھر وہ کیسے اُٹھا لے گا تیرے ..... رنگ ہر وقت اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔"

بیگم گلناز بڑبڑاتی ہوئیں تیمور کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ان کے دو ہی بیٹے تھے تیمور اور منصور .....

تیمور اٹھارہ سال کا تھا اور بی ایس سی کر رہا تھا جب کے منصور کی عمر ابھی تیرہ چودہ سال کے قریب تھی اور وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ان کے شوہر فوج میں آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصے بعد ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ اسی میں انتقال کر گئے۔ گلناز بیگم نے شوہر کے ریٹائرمنٹ کے پیسے ایک انویسٹمنٹ کمپنی میں جمع کرا دیئے تھے جہاں سے ہر مہینے ایک معقول رقم منافع کی صورت میں مل جاتی تھی۔

منصور کی پڑھائی کے اخراجات بھی خاصے تھے اس لئے کہ وہ خاص اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ منصور کے منہ میں اللہ تعالیٰ نے زبان تو دی تھی لیکن وہ بول نہیں سکتا تھا۔ وہ پیدائشی گونگا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد بیگم گلناز کی اپنے دونوں بچوں پر خاص توجہ تھی لیکن منصور کے مقابلے میں وہ تیمور کا زیادہ خیال رکھتیں کیوں کہ تیمور خاصا نازک مزاج واقع ہوا تھا۔ ٹھنڈا پانی پی لینے سے اسے نزلہ ہو جاتا۔ تیز مرچوں والا سالن وہ کھا نہیں سکتا تھا۔ زیادہ پیدل چلنے سے اس کی سانس پھول جاتی اور پھر جب سے اس کا "اپنڈکس" کا آپریشن ہوا تھا تو ڈاکٹروں نے اسے وزنی سامان اُٹھانے سے منع کیا تھا۔ تب سے وہ اور زیادہ آرام طلب ہو گیا تھا۔ بی ایس سی کرنے کے بعد وہ زیادہ وقت گھر پر ہی گزارتا۔ گھر پر زیادہ وقت گزارنے کی وجہ اس کا مصوری کا شوق تھا۔ وہ پرائمری جماعت سے ہی تصویریں بناتا تھا اور جب بڑی جماعتوں میں آیا تو تب بھی اس کا یہ شوق جاری رہا۔ اس کا ایک الگ کمرہ تھا جہاں رنگ برنگ تصویریں، کینوس، برش اور رنگ بکھرے نظر آتے۔ اسے جنون کی حد تک تصویریں پینٹ کرنے کا شوق تھا۔ جب وہ تصویروں میں رنگ بھر رہا ہوتا تو پھر اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ ماں ہی اسے کھانا لے جا کر اس کے کمرے میں دیتی۔ اپنے چھوٹے بھائی منصور سے وہ خاصا کھنچا کھنچا رہتا۔ اسے نہ جانے اپنے گونگے بھائی سے خدا واسطے کا بیر تھا کہ ہر وقت اسے ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا۔

کچھ دنوں سے وہ اپنی ایک تصویر پر کام کر رہا تھا اور اس نے ماں کو بتایا تھا کہ اس تصویر کے مکمل ہونے میں ایک مہینہ لگے گا۔ بیگم گلناز اس کے شوق کو بُرا نہیں سمجھتی تھیں۔ لیکن چند مہینے پہلے جب انویسٹمنٹ کمپنی لوگوں کے پیسے لے کر کہیں بھاگ گئی تھی تو بیگم گلناز کی لگائی ہوئی رقم بھی ڈوب گئی تھی۔ وہ خاصی پریشان تھیں۔ کیوں کہ ایک لگی بندھی آمدنی ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے دبے دبے لفظوں میں کئی بار تیمور کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کوئی نوکری تلاش کرے تاکہ گھر کا خرچ احسن طریقے سے چل سکے۔ کیونکہ ان کے شوہر مرحوم کی پنشن کی رقم گھریلو خرچوں کے لئے ناکافی تھی۔ تیمور نے ماں کو یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی شاہکار تصویر مکمل کرنے کے بعد نوکری تلاش کرے گا لیکن تصویر مکمل ہونے کے بعد بھی جب دو مہینے گزر گئے تو تیمور نوکری تلاش نہ کر سکا کیونکہ اسے ڈبل نمونیا ہو گیا تھا اور وہ بستر سے لگ گیا۔ بیگم گلناز ایک تو گھریلو خرچے سے پریشان تھیں پھر دوسرے تیمور کی بیماری اور دوا دارو نے الگ ان کی کمر توڑ کر رکھ دی لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ گھریلو خرچے کی فکر سے بے نیاز ہو کر جی جان سے تیمور کی خدمت میں جُت گئیں۔

تیمور ٹھیک ہوا تو خاصا کمزور ہو گیا۔ ڈاکٹرز نے

اسے کم از کم دو مہینے آرام کا مشورہ دیا۔ بیماری کے دوران اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ٹھیک ہونے کے بعد وہ فوراً نوکری تلاش کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیماری پر جو پیسہ لگا ہے وہ ماں نے اپنی کسی سہیلی سے اُدھار لیا ہو گا۔

وہ اب خاصا ٹھیک ہو گیا تھا اور گھر سے باہر دوستوں میں آنے جانے لگا تھا۔ رات دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے اسے خاصی دیر ہو جاتی اور وہ بارہ ساڑھے بارہ بجے ہی گھر میں قدم رکھتا۔ ماں اسے کہتی جلدی آ جایا کرو۔ وہ جلدی آنے کا وعدہ کر لیتا لیکن وعدہ کبھی پورا نہ ہوتا۔ جب سے وہ ٹھیک ہوا تھا تصویر بنانے کا شوق ختم ہو گیا تھا اور دوستوں کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے کا چسکا لگ گیا تھا۔

جمعہ کا دن تھا۔ تیمور رات دیر سے گھر آیا تو دیر تک سوتا رہا۔ بارہ بجے دوپہر ماں نے اُٹھایا تو نہا دھو کر اس نے جمعے کی نماز پڑھی۔ گھر آیا تو کھانا تیار تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک اسے منصور کا خیال آیا۔ منصور نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ماں! یہ منصور کہاں ہے؟ میں کئی دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں کہ وہ گھر میں کم کم نظر آتا ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد سارا دن کہاں غائب رہتا ہے؟"

ماں کچھ کہنے والی تھی کہ پڑوسن آ گئیں اور وہ باتوں میں مشغول ہو گئیں بات آئی گئی ہو گئی۔

تیمور کھانا کھا کر فارغ ہوا تو دوست آ گئے اور وہ ان کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل گیا۔ رات گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی تو ماں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

"کہاں ہے وہ آوارہ؟" تیمور اندر داخل ہوا تو اس کا لہجہ کھول رہا تھا۔ منصور کی چارپائی کے قریب پہنچ کر لحاف ایک طرف پھینکا۔ جھنجھوڑ کر اسے اُٹھایا۔ منصور گہری نیند میں تھا۔ لیکن ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سوتی جاگتی آنکھوں سے حیران ہو کر بھائی کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ بھائی کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ چٹاخ چٹاخ دو تھپڑ منصور کے گال پر سرخ نشانات بنا گئے۔

"آوارہ! اسکول سے آنے کے بعد سارا دن گھر سے باہر رہتا ہے اور....."

اتنا کہہ کر تیمور نے ماں کی طرف دیکھا پھر غصّے سے کہا۔

"اور آج رات اس گونگے آوارہ کو میں نے ہوٹل میں دیکھا۔ یہ لچھن ہیں اس کے بڑے مزے سے چائے پی رہا تھا وہاں۔ صاحب زادے! ان کی عمر دیکھیں ہوٹلوں میں چائے پینے کی ہے!"

بیگم گلناز دروازے کے پاس کھڑی اچانک پیش ہو جانے والا یہ منظر ہکا بکا دیکھ رہی تھیں۔ تیمور کی بات ختم ہوتے ہی تیر کی طرح آگے بڑھیں اور تیمور کے چہرے پر تھپڑوں کی برسات کر دی۔

"آوارہ تو تُو ہے..... تُو ہے آوارہ..... رات

رات تک دوستوں میں پھرتا رہتا ہے تجھے تو اس بات کی بھی فکر نہیں کہ گھر کا خرچ کس طرح چل رہا ہے اور تیری بیماری پر ہونے والا خرچہ کس نے اُٹھایا ہے؟"

اتنا کہہ کر بیگم گلناز کی آواز بھرّا گئی۔ گال پر ہاتھ رکھے سہمے ہوئے منصور کی طرف بڑھیں اور اسے اپنے گلے لگا کر رونے لگیں۔ پھر روتے روتے بولیں۔

"جسے تو آوارہ کہہ رہا ہے اور ہوٹل میں چائے پینے کا طعنہ دے رہا ہے وہی آوارہ ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ جب سے تُو بیمار ہوا ہے گھر کا خرچہ اسی "گونگے آوارہ" نے اٹھایا ہوا ہے..... اس کے یہ ہاتھ جو ابھی کاپی قلم تھامنے کے لئے ہیں ہوٹل میں برتن مانجھتے ہیں لوگوں کو چائے پلاتے ہیں..... اسے تیرا..... میرا اور گھر کا کتنا خیال ہے..... اور تُو....."

اتنا کہہ کر بیگم گلناز منصور کو خود سے لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

تب تیمور آگے بڑھا اور منصور کو ماں سے الگ کیا پھر سینے سے لپٹا کر اس کے گالوں کو چوما اور پھر اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے گلو گیر لہجے میں کہا۔

"مجھے معاف کر دینا بھائی! آوارہ تو میں ہوں اور تم..... تم "منصور" ہو!"

جب پاکستان میں
بارہ بجتے ہیں

ملک	وقت
آزاد کشمیر	۱۲ بجے دوپہر
آسٹریلیا	۸ بجے صبح
اٹلی	۸ بجے صبح
اسپین	۷ بجے صبح
افغانستان	۱۱.۳۰ بجے دوپہر
برطانیہ	۷ بجے صبح
بنگلہ دیش	۱ بجے دوپہر
بھارت	۱۲.۳۰ بجے دوپہر
ترکی	۹ بجے صبح
تھائی لینڈ	۲ بجے صبح
جاپان	۴ بجے شام
جرمنی	۸ بجے صبح
چین	۳ بجے سہ پہر
روس	۱۰ بجے صبح
سعودی عربیہ	۱۰ بجے صبح
سری لنکا	۱۲.۳۰ بجے دوپہر
عراق	۱۰ بجے صبح
لبنان	۹ بجے صبح
مصر	۹ بجے صبح

مرسلہ..... سعادت حسین کھوکھر، خیرپور میرس

ماہ رمضان کی فضیلت

عبدالقادر

ہر طرف ہے دھوم رمضاں کا مہینہ آگیا
رحمتوں اور برکتوں کا یہ خزینہ آگیا

اس مہینے میں ہوا قرآن کا لوگو نزول
اہتمام اس ماہ کا کرتے تھے اصحابِ رسولؐ

دل میں تقویٰ ہو یہی رمضان کا پیغام ہے
روزے داروں کے لیے خلد بریں انعام ہے

قید میں ہیں سارے شیطاں، کُھل گیا جنّت کا باب
ایک نیکی کر رہے ہیں اور ستّر کا ثواب

صبر کا ہے یہ مہینہ، صبر کی کیا بات ہے
صابروں کے ساتھ لوگو خود خدا کی ذات ہے

بھوک کا احساس ہوتا ہے مصیبت جھیل کر
رحم آجاتا ہے دل میں پھر ہر اک نادار پر

یوں نظر آتے تھے رمضاں میں محمدؐ مصطفےٰ
جیسے ہیں دریائے مہر و رحمت وجود و سخا

تین عشرے ماہ رمضاں کے ہمیں حاصل ہوئے
جو بہت انعام اور آرام کے حامل ہوئے

پہلا ہے رحمت کا عشرہ، مغفرت کا دوسرا
نار دوزخ سے خلاصی کا ہے عشرہ تیسرا

آخری عشرہ ہے رمضاں کا برائے اعتکاف
معتکف کی سب خطائیں اس میں ہوتی ہیں معاف

تیسرے عشرے میں ایسی رات آتی ہے حسین
جس میں آتے ہیں فرشتے، ساتھ ہی روح الامین

اس مبارک رات میں قرآن وہ نازل ہوا
جس سے عرفاں ذاتِ باری کا ہمیں حاصل ہوا

ایسا چشمہ قدر کی اس رات میں جاری ہوا
تاقیامت جو دل شیطان پر بھاری ہوا

سحری و افطار کے اوقات ہیں راحت فزا
خالقِ کون ومکاں ہے روزے داروں کی جزا

رحمت باری کا دریا آگیا ہے جوش میں
اے مسلماں تو بھی آجا اب ذرا سا ہوش میں

معذور ڈاکٹر

ذیشان بن صفدر

ایلن روزیر صبح بیدار ہوا تو خود کو بہت ہی تر و تازہ اور ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے روئیں روئیں سے خوشی کا ایک احساس پھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور کیوں نہ ہوتا، آج کا دن بھی تو ایسا ہی تھا۔ آج اس کی تعلیمی مدت تمام ہو رہی تھی۔ بہت جلد وہ ایلن روزیر کے بجائے ڈاکٹر ایلن روزیر کہلائے جانے کے قابل ہو جائے گا اور اسی احساس نے اسے مسرور اور شادمان کر دیا تھا۔

کیوں نہ آج کالج جانے کے بجائے چھٹی ہی کر لی جائے۔ ایلن نے بستر سے اٹھتے ہوئے سوچا۔ یوں بھی آج آخری کلاس ہے نصاب تو سارا ختم ہو ہی چکا ہے۔ صرف الوداعی باتیں ہوں گی۔ لے دے کر اب امتحان کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے جسے وہ کسی بھی دشواری کے بغیر پورا کرے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ چھٹی کر کے آج کا دن کیسے گزارا جائے۔

کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اس کے ذہن میں سوئمنگ کرنے کے خیال نے مکمل ارادے کی صورت اختیار کر لی اور وہ گھر سے سوئمنگ کے لئے تیار ہو کر نکل کھڑا ہوا۔

ایلن روزیر کافی دیر تک تیراکی میں مصروف رہا۔ اس طرح اپنے شوق کی تکمیل ہی نہیں پڑھائی کی تھکن بھی اتار رہا تھا۔ گزشتہ کئی ماہ سے پڑھائی کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس دوران اس نے ایک بھی غیر حاضری نہیں کی تھی۔ ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے کالج میں اس کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج وہ اپنی آخری کلاس چھوڑ کر یہاں چلا آیا تھا۔ ایلن چھٹی کے اس موقعے پر اپنی ذہنی تھکن اتار کر امتحان کی تیاری کے لئے بالکل تازہ دم ہو جانا چاہتا تھا۔ ان ہی خیالات میں گم تیرتے ہوئے اس نے ایک بار تیزی سے بیک اسٹروک لگایا تو کسی سخت سی چیز سے ٹکرا گیا۔ ایلن کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی تیز رفتار گاڑی سے ٹکرایا ہو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سخت چوٹ لگی تھی۔ وہ جس تالاب میں تیراکی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔

تالاب میں اور دوسرے بہت سے لوگ بھی تیراکی کے شغل میں مصروف تھے۔ ان میں سے کئی لوگوں نے ایلن کو پانی کی سطح سے اچانک غائب ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ان میں سے ایک ماہر تیراک نے تیزی سے غوطہ لگا کر تہہ میں جاتے ہوئے ایلن کا پیچھا کیا اور اس کے تہہ میں پہنچنے سے پہلے ہی اسے دبوچ لیا۔ پھر بڑی مہارت سے تیرتا ہوا ایلن کو ساتھ لئے تالاب کی سطح پر آ گیا۔ تالاب سے باہر نکال کر کنارے پر ایلن کو لٹا دیا اور پھر اسپتال کو ایمرجنسی اطلاع بھی فون پر کر دی گئی۔ خبر ملتے ہی ایک ایمبولینس جائے واردات پر پہنچ گئی جس نے ایلن کو اسپتال لے جا کر ایمرجنسی وارڈ میں فوری طبی امداد کے لئے پہنچا دیا۔

ہوا یوں کہ ایلن روزیر اپنے مستقبل کے خیالوں میں مگن تیرتا ہوا تالاب کے اس حصے کی طرف نکل گیا تھا جہاں اوپر اسٹینڈ سے ایک تیراک چھلانگ لگانے کے لئے تیار تھا۔ تینتیس فٹ بلندی سے کود کر جب وہ نیچے پہنچا تو ایلن روزیر کی کمر کے اوپر گرا۔ اس خطرناک حادثے کی وجہ سے ایلن کی زندگی شدید خطرے سے دوچار تھی۔ اگر اسے بر وقت اسپتال پہنچا کر طبی امداد بہم نہ پہنچائی گئی ہوتی تو شائد وہ تالاب کی تہہ میں پہنچتے پہنچتے موت سے ہم آغوش ہو گیا ہوتا۔ اس کی زندگی تو بچا لی گئی۔ مگر اب وہ بالکل ہی معذور ہو کر رہ گیا تھا۔

"آپ کے بیٹے کو اب ساری عمر دیکھ بھال کی سخت ضرورت ہوگی۔" ڈاکٹر نے ایلن کی بیوہ ماں سے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

ڈاکٹر نے غلط نہیں کہا تھا۔ ایلن کی ریڑھ کی ہڈی کو شدید ترین نقصان پہنچا تھا۔ اسے پورے سال اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا۔ یہ سال ایلن روزیر کی زندگی کا بہت ہی تکلیف دہ اور مشکل ترین سال تھا۔ ہر لمحے وہ کسی

معجزے کی توقع کرتا رہتا۔ ایسا معجزہ جو اچانک اس کی ریڑھ کی ہڈی پھر سے بالکل ٹھیک کر دے وہ ایک صحت مند اور نارمل انسان کی طرح زندگی کے ہنگاموں میں حصہ لینے لگے۔ اپنے معمولات خود انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہ ایک تعلیم یافتہ ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارنے لگے۔

ایلن روزیر کو بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کی آرزو تھی ڈاکٹر کی زندگی گزارنا، دوسروں کی خدمت کرنا، انہیں امراض کے دکھوں سے نجات دلانا۔ اس کی زندگی کا اہم ترین خواب تھا اور جب وہ منزل کے قریب پہنچا تو یہ حادثہ ہو گیا۔ کبھی کبھی تو وہ مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب کر رہ جاتا۔ وہ سوچتا اب میں بالکل بیکار ہو کر رہ گیا ہوں۔ ڈاکٹر بن کر دوسروں کی خدمت کرنا تو دور کی بات اپنی ہی خدمت آپ کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔

پھر ایک دن اس کی سوچ، اس کے خیالات میں ایک نئی تبدیلی آئی **یہ تبدیلی کسی معجزے سے کم ہرگز** نہیں تھی۔ اس نے سوچا مایوس ہو کر جینے سے کچھ نہیں ہو گا بستر پر پڑے رہنے سے اور خود پر افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہنا چاہئے کہ زندگی عمل سے عبارت ہے۔ پھر اسے اپنی نصابی کتب کا خیال آیا۔ ماں سے کہا۔

"مجھے میری کتابیں لا دیں۔ میں امتحان کی تیاری کروں گا۔ میں ڈاکٹر بنوں گا۔"

کچھ عرصے بعد ایلن روزیر کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ وہ اپنے گھر واپس آ گیا۔ جہاں اس کا ہر ہر لمحہ مطالعے میں گزرتا۔ گذشتہ ایک سال کے دوران بستر پر لیٹے لیٹے وہ بہت سی باتیں بھول گیا تھا۔ اس نے نئے سرے سے کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کا شوق، ہمت اور لگن دیکھ کر دوسرے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اس کی مجبوری اور جذبے کو دیکھتے ہوئے اسے خصوصی طور پر لیٹے لیٹے ہی امتحان دینے کا موقع دیا گیا اور اس کے گھر کو ہی امتحان ہال بنا دیا۔ نتیجہ آیا تو اس کی ماں، دوستوں، عزیزوں اور خود اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ ایلن نہ صرف امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ اس نے دوسری پوزیشن بھی حاصل کی تھی۔ بستر سے خود اٹھ نہ سکنے والے ایک معذور کے لئے اس سے بڑا کارنامہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

اب وہ ایلن کے بجائے ڈاکٹر ایلن بن چکا تھا۔ اس کی بچپن کی دیرینہ آرزو حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ خود معذور ہونے کی وجہ سے دوسرے مریضوں کا علاج نہیں کر سکتا۔ خواب کو اس کی تعبیر مل گئی تھی۔ اس **کیلئے** اسے خود اپنی تکلیف اپنا دکھ پہلے دور کر کے خود کو چلنے پھرنے، اور اٹھنے، بیٹھنے کے قابل بنانا تھا۔ تاکہ اپنے مریضوں کی خدمت کے لئے ان کے پاس پہنچ سکے۔

سومرسٹ لینڈ میں ان دنوں کوئی اسپتال یا میڈیکل سینٹر معذوروں کے علاج کے لئے نہیں تھا۔ ڈاکٹر ایلن اس حقیقت سے خود بھی واقف تھا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور اس کے متعلق برابر

معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس کے اپنے وطن میں نہ سہی دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں کوئی ایسا اسپتال ہے؟ جہاں اس کی معذوری کا علاج ہو سکے آخر اس کی یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ فرانس میں ایک ایسا اسپتال موجود ہے جو اسے چلنے پھرنے کے قابل بنا سکتا ہے۔ ایلن فرانس کے سفر کے لئے تیار ہو گیا۔ اسے ایک اسٹریچر پر لٹا کر طیارے میں سوار کرایا گیا اور ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو اسے فرانس کے فوئین بلیو اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ اب ایلن کو اپنے صحت یاب ہونے کی قوی امید ہو چکی تھی۔ حالانکہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ ریڑھ کی ہڈی جوڑ دینا کسی بھی سرجن کے بس کی بات نہیں اور ہوا بھی یہی اس کی تمام ٹریٹمنٹ رپورٹیں دیکھنے کے بعد اس کے معالج نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے ڈاکٹر ایلن آپ تمام عمر اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن ہماری یہ کوشش ضرور ہوگی کہ آپ کو دوسروں کا محتاج بھی نہ بننے دیں۔"

ڈاکٹر مارک کی اس بات سے ایلن کو شدید ذہنی اور دلی صدمہ ہوا اور کافی دیر تک اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا۔

اگلے نو ماہ تک ڈاکٹر ایلن کو کئی نئی ورزشیں کرائی گئیں ان ورزشی مشقوں کے ذریعے ایلن کو بازو، پیٹ اور سینے کے پٹھوں کو مضبوط تر بنایا گیا۔ آخر سخت محنت اور کوشش کے بعد ایلن روزیر کو بستر پر لیٹے رہنے سے نجات مل گئی۔ وہ اس قابل ہو گیا کہ ویل چیئر پر بیٹھ کر اپنے طبّی سرگرمیوں شروع کر سکے اور اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مارک کا وعدہ بھی پورا ہو گیا ڈاکٹر مارک نے اسے فوراً اسپتال سے رخصت کر دینے کے بجائے کچھ عرصے مزید اپنے ساتھ رکھنا پسند کیا۔ اس دوران ایک دن ڈاکٹر مارک نے ایلن سے دریافت کیا کہ "آپ اپنے وطن واپس جا کر کیا کریں گے؟"

ایلن روزیر کے لئے یہ سوال قطعی غیر متوقع تھا وہ فوری جواب نہ دے سکا۔ اس کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر مارک نے خود ہی تجویز پیش کی،

"آپ وطن جا کر اپنی زندگی کو معذور لوگوں کی خدمت کا مشن کیوں نہیں بنا لیتے؟"

یہ سنتے ہی ڈاکٹر ایلن کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آ گئی اس کے لب مسکرا اٹھے۔ ڈاکٹر مارک نے اس کے سامنے ایک عظیم مقصد پیش کیا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر مارک پوشیدہ الفاظ میں اس سے کہہ رہا ہے، کہ میں نے تمہارے دکھ کو دور کیا ہے، تم بھی دوسروں کے دکھ دور کرو۔ ایلن روزیر نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ وطن واپس پہنچ کر ایک ایسا اسپتال ضرور قائم کرے گا جہاں معذور افراد کا علاج آسانی سے کیا جا سکے۔

ڈاکٹر ایلن سوئٹزرلینڈ واپس پہنچ کر جب ائر پورٹ پر اترا تو وہاں اس کی ماں اور بہن استقبال کے لئے موجود تھیں۔ انہیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ جو ایلن اسٹریچر پر لیٹ کر فرانس گیا تھا اب ویل

چیئر پر بیٹھ کر واپس آیا ہے۔

ڈاکٹر ایلن نے وطن واپسی کے ساتھ ہی دن رات کام کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے ان یونیورسٹیوں اور تعلیمی مراکز سے مراسلت کی جو معذور لوگوں کو تعلیم دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ پھر اپنے عظیم مقصد کے لئے اس نے برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے کامیاب دورے بھی کئے۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر ایلن روزیر کو سوئٹزرلینڈ کے اس پہلے میڈیکل سینٹر کا چیف مقرر کیا گیا جو معذور افراد کے علاج کے لئے قائم ہوا تھا۔ اس کی شہرت بہت جلد دنیا بھر میں پھیل گئی۔ بہت سے میڈیکل کالجوں تعلیمی اداروں نے ڈاکٹر ایلن کو اپنے یہاں لیکچرز دینے کے لئے مدعو کیا۔ ۱۹۷۸ء میں امریکہ میں بھی ایک ایسا ہی سینٹر اس کی نگرانی میں قائم ہوا جو ریڑھ کی ہڈی کے علاج کے لئے دنیا بھر میں اہم ترین مرکز تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایک گفتگو کے دوران کسی پرانے دوست نے ڈاکٹر ایلن سے سوال کیا، کیا آپ کو اس بات پر دکھ یا افسوس ہوتا ہے کہ اگر آپ اس دن بھی معمول کے مطابق کالج چلے گئے ہوتے تو زندگی میں اتنی تکالیف اور دکھ جھیلنے سے محفوظ رہتے۔

ڈاکٹر ایلن روزیر نے بڑے سکون، اطمینان اور دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"نہیں میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ کیوں کہ مجھے اس بات پر مکمل یقین ہے کہ خدا جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔ قدرت ہمیشہ انہونی باتیں، مختلف حادثات، اور واقعات کے ذریعے یہ ثابت کرتی ہیں کہ خدا ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے اسی کا ہے مجھے اس حادثے پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ مجھے اتنی اچھی زندگی اس حادثے کے بعد گزارنے کو ملی شاید نہ گزار سکتا۔ میں نے دکھی لوگوں کی جتنی خدمت اب کی ہے شائد وہ اس حالت میں ممکن نہ ہوتی۔ میں واقعی خود کو ایک خوش قسمت انسان تصور کرتا ہوں۔"

اور سوال پوچھنے والا دوست شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔

زبان

بنگالی — دن گزر جاتے ہیں مگر زبان سے نکلے ہوئے لفظ نہیں جاتے۔

ترکی — تلوار کے زخم بھر سکتے ہیں لیکن زبان کے نہیں۔

جاپانی — ایک بالشت کی زبان پانچ فٹ لمبے انسان سے ناراض ہے۔

اطالوی — بے وقوف کا دل اس کی زبان پر ہے اور عقلمند کی زبان اس کے دل پر ہے۔

روسی — جلن کو شفا ہو جاتی ہے مگر جو زخم زبان پہنچاتی ہے وہ اچھے نہیں ہوتے۔

عربی — جاہل کی زبان اس کی مرگ کی کلید ہے انسان کی سلامتی اس کے بند رکھنے میں ہے۔

چینی — منہ کی زبان تمام مصیبتوں کا سرچشمہ ہے۔

مرسلہ ..... سید محمد نعیم نقوی، کراچی

REPCOM LASER DOT

مجھے معاف کر دینا

عثمان بن سلیم

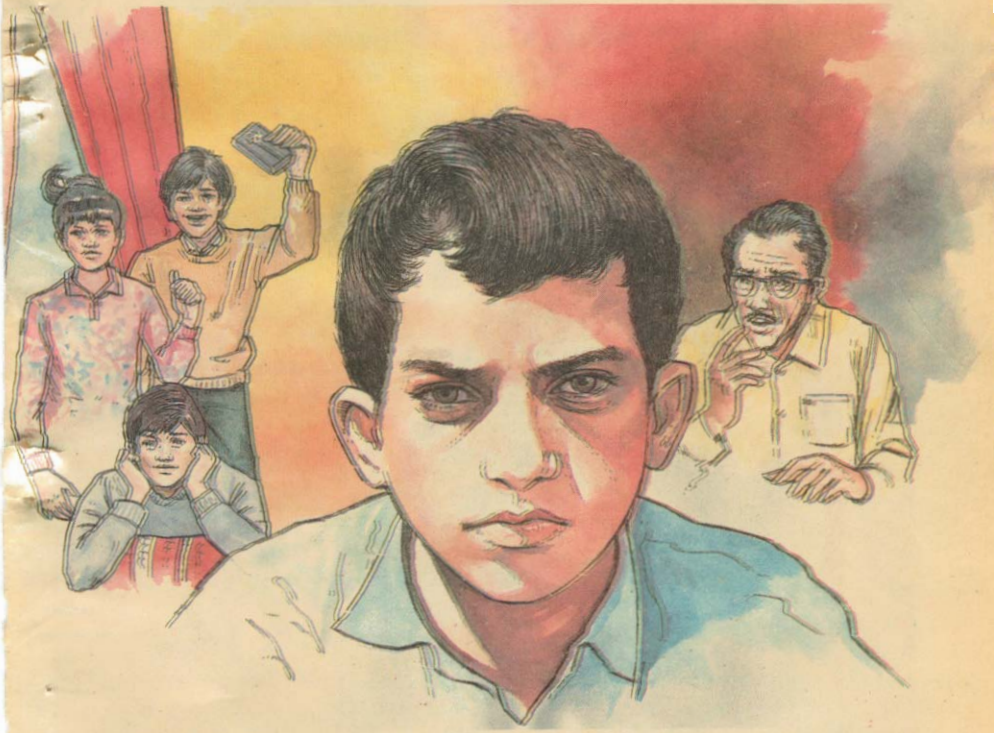

جبار صاحب نے ڈرائنگ روم سے نذیر کو کوئی چوتھی بار آواز دی تھی اور وہ پانچویں آواز پر تقریباً دوڑتا ہوا آیا تھا۔

"جی صاحب جی! آپ نے مجھے بلایا تھا؟" کاندھے پر تولیہ ڈال کر وہ بالکل مؤدب ہو گیا۔

"چائے لے آؤ۔" نذیر صاحب نے کہا۔ اس کے دیر سے آنے پر ان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ "جی صاحب! پائے..... پائے تو ابھی گلے نہیں ہیں..... خانساماں گلا رہا ہے انہیں.....!!"

"پائے کے بچے..... میں نے چائے کہا ہے چائے!!!" جبار صاحب نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہو گئے تھے، جب کہ ان کے دوستوں کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

"اچھا صاحب! آپ چائے کہہ رہے ہیں۔" نذیر نے حسبِ عادت اپنے دونوں کانوں

میں اُنگلی گھمائی پھر کانوں پر اس طرح ہاتھ مارا جیسے صاف کر رہا ہو۔ "احمق کہیں کا!" جبار صاحب بڑبڑائے۔ "جی صاحب! آپ نے کچھ کہا؟" "کہا کے بچے! چائے لاؤ ..... جاؤ!!" "جی صاحب..... آؤ..... میں سمجھا نہیں؟" نذیر جاتے جاتے رُک گیا۔ حسبِ عادت اس کا ہاتھ کان پر تھا۔

"افوہ! کس احمق سے پالا پڑ گیا ہے۔" جبار صاحب جھنجھلا گئے تو مہمان ہنس پڑے۔ گدھے! جلدی سے چائے لاؤ۔" وہ اونچی آواز میں دھاڑے تو نذیر نے گھبرا کر اپنے کانوں میں اُنگلی گھمائی، دو ہاتھ مارے اور پھر جلدی سے باہر نکل گیا۔

اس کے ڈرائنگ روم سے جانے کے بعد جبار صاحب اپنے دوستوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ "معاف کیجئے گا..... کم بخت اونچا سنتا ہے۔" "کوئی بات نہیں جبار صاحب..... اس میں اس بے چارے کا کیا قصور؟" ایک دوست نے کہا۔ چند ہی لمحوں بعد چائے آگئی تو سب چائے پینے لگے۔

اسی دن جب ان کے دوست چلے گئے تو رات کے کھانے پر جبار صاحب نے گھر والوں کو بتایا کہ مہینے کے پورا ہونے پر وہ نذیر کو ملازمت سے نکال دیں گے کیوں کہ وہ اونچا سنتا ہے۔ اس کے سامنے بار بار بات دہرانی پڑتی ہے جس کی وجہ سے مہمانوں اور دوستوں کے سامنے ان کی سُبکی ہوتی ہے۔ سب نے ان کا فیصلہ خاموشی کے ساتھ سنا کہ جبار صاحب اصولوں کے پابند اور غصے کے کافی تیز تھے۔ پھر وہ ریٹائرڈ فوجی تھے۔ کسی کو ان کے فیصلے کے آگے چوں چراں کی گنجائش نہ تھی۔ سب کو تو پتہ چل گیا تھا۔ لیکن اس بات کا علم نذیر کو نہیں ہو سکا تھا۔ پچھلے چند مہینوں سے وہ جبار صاحب کے ہاں ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال ہوگی۔ کام کاج میں تو وہ خاصا تیز تھا، ہر کام سلیقے اور ڈھنگ سے کرتا تھا لیکن اس کے اونچا سننے کی عادت اسے لے ڈوبی تھی۔

جبار صاحب کا گھرانہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ان کی بیگم اور تین بچے۔ حارث، وارث اور تانیہ۔ حارث فرسٹ ایر میں تھا، وارث نویں میں اور تانیہ پانچویں میں۔ تینوں بچوں میں بڑی محبت تھی۔ ان کی تربیت بے حد اچھے انداز میں ہوئی تھی۔ وہ مہذب، ملنسار اور دوسروں کا احترام کرنے والے بچے تھے۔

جبار صاحب نے رات کے کھانے پر نذیر کو مہینے کے اختتام پر ملازمت سے نکالنے کا جو فیصلہ کر لیا تھا اسے سُن کر تینوں بچے اداس ہو گئے۔ انہیں نذیر سے گہری ہمدردی تھی۔ انہیں اس کی معذوری کا احساس بھی تھا۔ شام کو جب وہ پڑھنے بیٹھتے تو نذیر کو بھی خاص طور پر پڑھاتے۔ نذیر کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ نہایت دلچسپی سے پڑھتا حالاں کہ اسے پڑھاتے وقت انہیں کافی

دِقت کا سامنا کرنا پڑتا..... وہ قاعدے میں لکھا ہوا سبق نذیر کو پڑھاتے "پُل پر جا" تو نذیر پڑھتا "کھل کر کھا۔"

دوسرے دن شام کو تینوں بچے پڑھنے کے کمرے میں بیٹھے تو نذیر کے بارے میں فکر مند تھے۔ "بھیا! کیا آپ پاپا کو نہیں سمجھا سکتے کہ وہ نذیر کو نوکری سے نہ نکالیں۔ بے چارہ گاؤں سے شہر اس لئے آیا ہے کہ چند پیسے کما کر گھر بھیج سکے۔" تانیہ نے حارث سے کہا تو حارث کندھے اُچکا کر بولا۔ "پاپا کو میں کیسے سمجھاؤں..... وہ جو فیصلہ کر لیں پھر اسے بدلنا مشکل ہی ہوتا ہے۔" "تو بھائی! کوئی ایسی ترکیب سوچیں جس کی وجہ سے پاپا نذیر کو ملازمت سے نکالنے کا فیصلہ واپس لے لیں۔" وارث نے کہا تو حارث کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اچانک خوشی سے بولا۔ "ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں لیکن اس میں کافی سارے پیسے خرچ ہوں گے.....!!

"کتنے؟؟" تانیہ اور وارث نے ایک ساتھ پوچھا۔

"یہی کوئی دو ڈھائی ہزار۔"

"دو ڈھائی ہزار..... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" دونوں بچوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ "تم لوگ فکر مت کرو..... ڈیڑھ ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں باقی ایک ہزار کا بندوبست کرنا پڑے گا!!" حارث نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو وارث جوش سے بولا "بھائی ایک ہزار روپے تو آپ کو آسانی سے مل جائیں گے..... میرے پاس چھ سو روپے جمع ہیں جبکہ تانیہ نے چار سو سے کچھ زائد جمع کئے ہیں۔"

"پھر تو کام بن گیا۔" حارث نے چٹکی بجائی۔

لیکن بھائی! ان ڈھائی ہزار روپوں کا آپ کریں گے کیا؟" تانیہ اور وارث نے مشترکہ آواز میں پوچھا۔ "بس تم دیکھتے رہو..... سب بتا دوں گا۔"

اتنے میں نذیر اپنا قاعدہ لئے آگیا تو وہ اسے پڑھانے بیٹھ گئے۔

جبار صاحب کے دوست آئے تو وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ "نذیر.....!!" جبار صاحب نے آواز دی تو نذیر پہلی آواز پر ہی دوڑتا چلا آیا۔ حالاں کہ اس نے سر پر گرم ٹوپی اوڑھی ہوئی تھی جس میں اس کے کان بھی چھپ گئے تھے۔ "مہمانوں کے لئے چائے لے آؤ۔"

"جی بہتر!" نذیر نے تابعداری سے سر ہلایا۔ "ابھی لایا۔" وہ واپس جانے لگا تو جبار صاحب نے کہا۔ "سنو!" "جی صاحب!" نذیر رک گیا۔ خانساماں سے کہنا کچھ پکوڑے بھی تل لے۔" "ٹھیک ہے صاحب..... پکوڑوں کا بھی کہہ دوں گا۔" نذیر چلا گیا تو جبار صاحب کے دوست کہنے لگے "جبار صاحب! آج تو آپ کا نوکر بالکل ٹھیک نظر آرہا ہے۔"

"ہاں میں بھی دو دن سے نوٹ کر رہا ہوں کہ کم بخت بالکل ٹھیک سن رہا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد بڑے اہتمام اور سلیقے سے نذیر چائے اور پکوڑے لے آیا اور جب جبار صاحب کے دوست کھا پی کر چلے گئے تو جبار صاحب نے نذیر کو بلوا لیا۔

"ادھر آؤ!"

"جی صاحب!"

"یہ تمہارے کان کس طرح ٹھیک ہو گئے ؟ ..... تم تو اونچا سنتے تھے۔"

"وہ جی! میں نے کانوں میں یہ آلے لگا لئے ہیں کیا کہتے ہیں صاحب اسے ..... ٹیلی فون!!" نذیر نے سر سے ٹوپی اتار دی اور کانوں میں لگا سماعت کا آلہ ایئر فون دکھانے لگا۔

"اچھا..... کس نے لگائے یہ؟"

"حارث صاحب، تانیہ صاحبہ اور وارث صاحب نے جی..... وہ سب مجھے کانوں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے..... ڈاکٹر صاحب نے کانوں کا معائنہ کر کے لگا دیئے جی ٹیلی فون! اب مجھے تمام آوازیں بالکل صاف سمجھ میں آتی ہیں جی اور..... اور میں نے کل اپنا سبق بھی بالکل ٹھیک ٹھیک پڑھا ہے صاحب جی..... وہ میں آپ کو سناؤں..... پُل پر جا..... سب کے کام آ..... سات آم لا..... دس بار جا!!!"

نذیر پورا سبق سنانے لگا تھا لیکن جبار صاحب کو تو بس ایک ہی جملہ یاد رہ گیا تھا۔

"سب کے کام آ..... سب کے کام آ۔"

"بس بس جبار صاحب چلائے تو نذیر ایک دم سے چُپ ہو گیا۔ "جاؤ حارث، وارث اور تانیہ کو بلا لاؤ۔" جبار صاحب نے اس بار نرم لہجے میں کہا تو نذیر دوڑتا ہوا گیا اور تینوں کو بُلا لایا۔

بچے آ گئے تو جبار صاحب نے آہستہ سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ!" بچے خاموشی سے صوفوں پر بیٹھ گئے تو جبار صاحب کُرسی سے اُٹھ کر کھڑکی تک گئے۔ آہستہ آہستہ اپنے دونوں ہاتھ مسلتے رہے..... اور کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے پھر پلٹ کر بچوں کے قریب آئے۔ نذیر ابھی تک ایک کونے میں کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اپنے بچوں کو دیکھتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔ "مجھے اپنی تربیت پر فخر ہے لیکن..... شاید میری اپنی شخصیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔" اتنا کہہ کر انھوں نے تینوں بچوں کے کاندھے تھپتھپائے اور پھر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے نذیر کے قریب گئے پھر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھرائی آواز میں بولے۔ "میری شخصیت آج میرے بچوں نے مکمل کی ہے..... مجھے معاف کر دینا نذیر!!"

نذیر نے گردن اُٹھا کر دیکھا تو سدا کے سخت مزاج جبار صاحب کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے آنسو تیر رہے تھے.....!!!

لاریب فیہ

محمد جاوید خالد

یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں کہ کلام خدا ہے، خدا سے ڈرنے والوں کی رہنمائی ہے۔
(قرآن حکیم)

قرآن رب کا
رہبر ہمارا
پیارے نبی ؐ پر
اس نے اتارا
ہے خیر و برکت
سارے کا سارا

لاریب فیہ
لاریب فیہ

سارے جہاں پر
لطف و عنایت
سب کی بھلائی
ہے غرض و غایت
جو متقی ہیں
ان کی ہدایت

لاریب فیہ
لاریب فیہ

جو ہیں خدا پر
ایمان والے
سچّی نمازوں
کی شان والے
ہرگز نہیں وہ
نقصان والے

لاریب فیہ
لاریب فیہ

راہِ خدا میں
اپنے خزانے
بخشے ہیں ان کو
جو کچھ خدا نے
وہ بانٹتے ہیں
حیلے بہانے

لاریب فیہ
لاریب فیہ

وہ بھی ہیں انساں
وہ بھی ہیں خاکی
لیکن انہوں نے
پائی ہے پاکی
ان کو بلندی
رب نے عطا کی

لاریب فیہ
لاریب فیہ

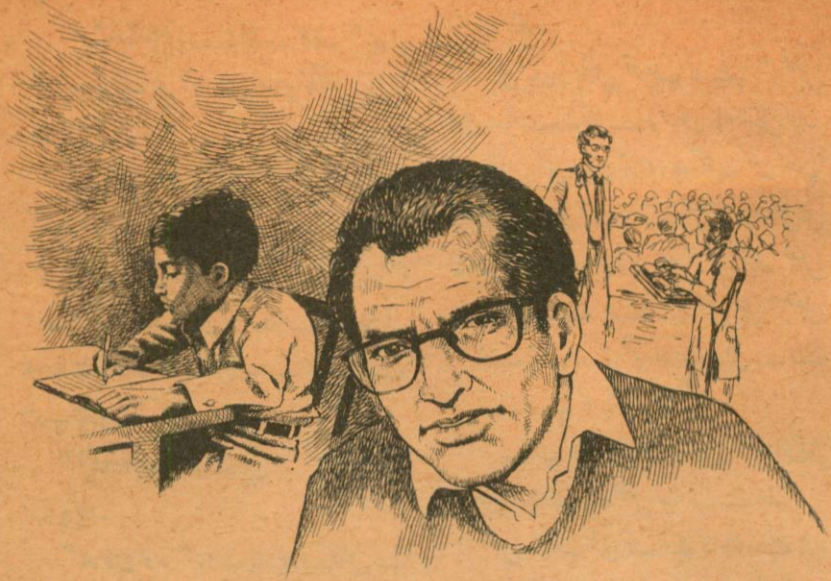

سہارے کی ضرورت

احسان الحق حقانی

پہلا پیریڈ ختم ہونے میں ابھی تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ سکندر صاحب نے ریاضی کی ایک مشق کا حل نکالا۔ چاک میز کی طرف پھینکا اور پرس اٹھا کر نکل گئے۔ سکندر صاحب کا نکلنا تھا کہ کلاس میں گویا زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹ کر شور مچانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اردو کا پیریڈ شروع ہو گیا۔ گھنٹی بجتے ہی اردو کے ٹیچر فضل سبحان صاحب کی جھلک دکھائی دی اور پھر حسب معمول چہرے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ سجائے فضل سبحان صاحب کلاس میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم۔" انہوں نے تختہ سیاہ پر کھنچی گئی آڑی ترچھی لکیروں کا جائزہ لیتے ہوئے سلام

کیا۔

"وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔" پوری کلاس نے ایک ہی آواز میں سلام کا مکمل جواب دیا۔

"آج کیا پڑھیں گے؟" سر فضل سبحان نے کتاب کھولتے ہوئے پوچھا۔

"لب پہ آتی ہے دعا، بن کے تمنا میری۔" سب لڑکوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ فضل سبحان صاحب سبق کے لئے خوب تیاری کر کے آتے ہیں۔

"اچھا! تو لب کسے کہتے ہیں؟" فضل صاحب نے پوچھا۔

"ہونٹوں کو۔" جواب پھر پوری کلاس نے دیا تھا۔

"اور تمنا؟"

"آرزو ..... خواہش۔" ملی جلی آوازیں آئیں۔

"شاب باش۔" فضل صاحب نے سب کو شاباش دی۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری ایک آرزو ہے ایک تمنا اور خواہش ہے جو دعا کی صورت میں میری زبان سے ..... یا ہونٹوں سے نکلتی ہے اور وہ تمنا، آرزو اور دعا کیا ہے؟ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!" سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"جی سر!" سب نے جواب دیا۔

May I Come in

اسکول کے ڈائریکٹر احمد سعید صاحب دروازے پر کھڑے تھے۔

"جی ہاں! بالکل تشریف لائیے۔" فضل سبحان صاحب نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ تمام کلاس بھی احتراماً کھڑی ہو گئی۔ احمد سعید صاحب کے ساتھ ایک دوسرا بچہ بھی تھا۔ جو پہلی ہی نگاہ میں تمام کلاس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ فضل سبحان صاحب کے چہرے سے بھی اپنی مستقل مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور وہ حیرانی سے نئے آنے والے بچے کا جائزہ لینے لگے۔

"یہ آپ کے نئے شاگرد ہیں۔" ڈائریکٹر احمد سعید صاحب نے فضل صاحب سے کہا۔

فضل صاحب ابھی تک بچے کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ جس کا رنگ کوئلے کی طرح سیاہ تھا۔ کمر کے دائیں طرف کبڑا پن تھا۔ جس کے باعث اس کا دایاں کندھا اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا تھا۔

"فضل صاحب میں نے کچھ کہا تھا۔" سعید صاحب نے اپنے الفاظ پر ذرا زور دیتے ہوئے فضل سبحان صاحب کو متوجہ کیا۔

"جی جی بالکل!" فضل صاحب سٹپٹا گئے۔

"بیٹھو۔" انہوں نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نئے بچے کو بیٹھنے کو کہا۔

"پیارے بچو! یہ آپ کا نیا ساتھی ہے اور چونکہ یہ جسمانی طور پر معذور ہے اس لئے آپ سب کا فرض ہے کہ اس کا خاص خیال رکھیں۔

ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے سر!" بچوں نے نیم دلی سے کہا۔ اور ڈائریکٹر احمد سعید صاحب سلام کر کے کلاس سے نکل گئے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" فضل صاحب نے نئے بچے سے پوچھا۔

"یوسف۔"

"توبہ ہے، ایسی شکل پر نام یوسف رکھا ہے۔" فضل صاحب نے دل میں سوچا۔ حالانکہ وہ اسکول کے سب سے اچھے استاد تھے اور سب ہی بچوں سے بہت محبت کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن بیچارے یوسف کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ دوسرے بچوں کی طرح فضل صاحب جیسے اچھے استاد بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہ کر سکے۔

"پہلے کس اسکول میں تھے؟" فضل صاحب نے دوسرا سوال کیا۔

"نور پبلک اسکول میں۔" یوسف نے جواب دیا۔

"تو وہاں سے کیوں آئے؟"

"بچے بہت تنگ کرتے تھے سر!" یوسف بہت شائستگی سے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔

"ابو کیا کام کرتے ہیں؟"

"ابو وفات پا گئے ہیں۔" یوسف نے پھر مختصر سا جواب دیا۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔" فضل صاحب نے غیر ارادی طور پر کہا۔ "اور امی؟"

"وہ بیمار رہتی ہیں۔" یوسف بھرپور توجہ سے جوابات دے رہا تھا۔

"تو پھر گھر کا خرچہ کیسے چلتا ہے؟" فضل صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"اللہ مالک ہے سر!" اب کے یوسف کے لہجے میں بے نیازی تھی۔ "اللہ میرا سچا دوست ہے سر! میں روزانہ پانچ مرتبہ اس کے گھر جاتا ہوں وہ مجھے اپنی کتاب کے ذریعے تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دل چھوٹا نہ کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر تم میرے سچے دوست ہو۔"

"شاب باش۔" فضل صاحب نے مسکرائے بغیر شاباش پر زور دے کر کہا۔ "اب کتابیں نکالو۔ پیریڈ ختم ہونے میں تھوڑی دیر ہے۔"

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

یوسف کو نئے اسکول میں منتقل ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس نے نئے اسکول میں آ کر کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی۔ پہلے کی طرح اب بھی لڑکے اسے تنگ کرتے تھے۔ کبھی اس کی بیساکھی غائب ہوتی اور کبھی بستہ لیکن یوسف نے کبھی اس طرح کے مذاق پر احتجاج نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ خاموشی سے اپنی گمشدہ چیز کا انتظار کرتا تھا اور کبھی بھی پریشانی یا بدحواسی کا مظاہرہ کر کے دوسرے لڑکوں کو مزہ لینے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ اس طرح اس نے حالات کو کافی حد تک قابو کر لیا تھا۔ لیکن ایک دن فضل سبحان صاحب کا پیریڈ

شروع ہوا۔ سب لڑکے فضل صاحب کے احترام میں کھڑے ہو کر جب بیٹھنے لگے تو عمر نے یوسف کے پیچھے سے کرسی کھینچ لی۔ یوسف دھڑام سے گر گیا۔ اور فوراً اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس "شرارت" سے اسے جسمانی طور پر تو کوئی چوٹ نہیں لگی۔ لیکن تمام کلاس کے قہقہوں میں فضل صاحب کو بھی اپنی مسکراہٹ چھپاتے دیکھ کر یوسف کے دل پر چوٹ لگی اور پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یوسف نے سوچا۔ "میں کس کس کو سمجھاؤں کہ میری ٹانگ کالنگ میری غلطی نہیں، میرے رنگ کی سیاہی میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میری کمر بھی میری وجہ سے کبڑی نہیں۔ مجھے دیکھ کر آپ ہنستے کیوں ہیں؟ آپ کو تو دکھی ہو جانا چاہئے۔ خدا نے مجھے کتنے سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔"

یوسف نے روتے ہوئے سوچا۔ لیکن کہا کچھ نہیں افضل صاحب نے عمر کو ذرا سا ڈانٹا اور کتاب کھول کر دعا کا بقیہ حصہ پڑھانے لگے۔

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

جمعہ کو شہر کے مرکزی گراؤنڈ میں ڈویژنل ہاکی ٹورنامنٹ کا فائنل میچ تھا۔ فضل سبحان صاحب کو ہاکی کے کھیل سے بہت دلچسپی تھی اس لئے وہ میچ دیکھنے گئے۔ دونوں ٹیمیں گراؤنڈ میں اتر چکی تھیں اور کپتان صاحبان ریفری سے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ تمام تماشائیوں کی طرح فضل صاحب کو بھی میچ شروع ہونے کا شدت سے انتظار تھا۔ گراؤنڈ کے ارد گرد چھابڑی والوں کے درمیان بھی اپنے اپنے مال کے لئے آوازیں لگانے کا مقابلہ جاری تھا۔ ایک طرف سے گرم چھولے کی آواز آئی تو دوسری طرف سے گرما گرم چھولے کی آواز۔ ریوڑی اور مونگ پھلی بیچنے والوں کے درمیان آوازیں لگنے کا الگ سے مقابلہ شروع تھا۔ فضل صاحب کا دھیان بھی بٹ گیا۔ اچانک ان کی نگاہ مونگ پھلی بیچنے والی ایک بچے پر پڑی۔ اس نے مونگ پھلی کے ایک ایک اور دو دو روپے والے پیکٹ بنا رکھے تھے اور پیکٹوں کے ایک چھوٹے سے انبار کے پیچھے خاموش بیٹھا مونگ پھلی فروخت کر رہا تھا۔

"یوسف۔" فضل صاحب بڑبڑائے اور پھر تیزی سے اٹھ کر بچے کے پاس پہنچ گئے۔

"یوسف!"

"یس سر، آپ!" یوسف حیران بھی ہوا اور کچھ پریشان بھی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" فضل صاحب بے حد حیرت زدہ تھے۔

"مونگ پھلی بیچ رہا ہوں۔" یوسف اب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔

"لیکن..... یہ..... یہ!" فضل صاحب سے بات نہیں بن رہی تھی۔

"میں نے تو آپ کو بتایا تھا سر۔" یوسف کہنے لگا۔ "کہ میرے والد فوت ہو چکے ہیں اور امی

بیمار رہتی ہیں۔ گھر کی ساری ذمہ داری .....

"لیکن تم نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ تم مونگ پھلی فروخت کرتے ہو۔" فضل صاحب یوسف کی بات کاٹتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی سر!"

"تو میں اب سمجھ گیا کہ تمہیں یہ اچھی اچھی باتیں ان ٹھوکروں نے سکھائی ہیں۔ یوسف بیٹا تم بہت عظیم ہو بہت عظیم ....." فضل صاحب بس رونے ہی والے تھے۔

"نہیں سر!" یوسف کی آواز بھی بھرا گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"نہیں بیٹا یہ بہت بڑی بات ہے۔ تم معذور ہو۔ لیکن ہم نے تمہاری معذوری کا کوئی خیال نہیں رکھا..... معذور تو ہم ہیں کہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے لیکن انشاء اللہ اب ایسا نہیں ہو گا۔"

"نہیں سر!" یوسف نے کہا۔ "آپ میرے ساتھ کوئی وعدہ نہ کریں۔ میں اپنے ہاتھوں سے کماتا ہوں۔ کیونکہ اللہ کے سب سے بڑے دوست رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اپنے ہاتھ سے کمانے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے۔" میں اللہ کا دوست ہوں سر! مجھے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔"

میچ شروع ہو چکا تھا لیکن اب فضل سبحان صاحب کی دلچسپی میچ سے ختم ہو چکی تھی انہوں نے یوسف کو اپنے سینے سے لگایا اور ایک نئے عزم کے ساتھ گراؤنڈ سے نکل گئے۔ ○ ..... ○

وضاحت

محترم قارئین!

اب تک آنکھ مچولی کا سالانہ چندہ -/۱۵۰ روپے تھا۔ لیکن ڈاک کے اخراجات میں ہوشربا اضافے کے بعد ہمیں بادلِ نخواستہ اس میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ آنکھ مچولی کے دس عام اور دو خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ -/۲۶۰ روپے بنتی ہے جبکہ ممبر شپ حاصل کرنے والے قارئین کو ان بارہ شماروں کے لئے صرف -/۲۰۰ روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں قارئین کو -/۶۰ روپے کی خصوصی بچت ہوگی اور سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

البتہ پہلے سے ممبر شپ رکھنے والے ساتھی اپنی ممبر شپ کی مدت پوری ہونے تک اس اضافے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین ہماری مجبوری کا احساس کرتے ہوئے اس اضافے کو قبول فرمائیں گے۔

(ادارہ)

س: جل کر ہر چیز ختم ہو جاتی ہے مگر سورج کیوں ختم نہیں ہوتا جب کہ اس میں کھربوں سال سے گیسیں جل رہی ہیں؟ محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔

ج: عمر صاحب! آپ کا سوال بہت اچھا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک سائنسی ذہن کے

مالک ہیں جو مختلف مظاہر قدرت پر غور فکر کرتا ہے۔ بہرحال آپ کے سوال کا جواب حاضر ہے۔ یہ درست ہے کہ سورج میں گیسوں کے جلنے کا معمولی عمل ہو رہا ہوتا تو یہ کبھی کا بجھ چکا ہوتا۔ اور پھر نہ یہ نظام شمسی ہوتا۔ نہ یہ دنیا اور نہ ہم اور آپ۔ سورج کی تپش اور روشنی جوہری گداخت کے عمل کی مرہون منت ہے۔ یہ عمل ایک تواتر اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ یہ جوہری گداخت کیا بلا ہے۔ تو بھائی اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک اور اصطلاح جوہری انشقاق کو سمجھئے۔ اس کا مطلب ہے شق ہو جانا یا پھٹ جانا۔ اس عمل میں جوہر پھٹ جاتا ہے اور نتیجتہً بہت زبردست توانائی خارج ہوتی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے بم جوہری انشقاق کے اصول پر بنائے گئے تھے۔ گداخت اس کا بالکل الٹ ہے۔ یعنی اس میں جوہر آپس میں مل کر بھاری عناصر کے جوہر بناتے ہیں۔

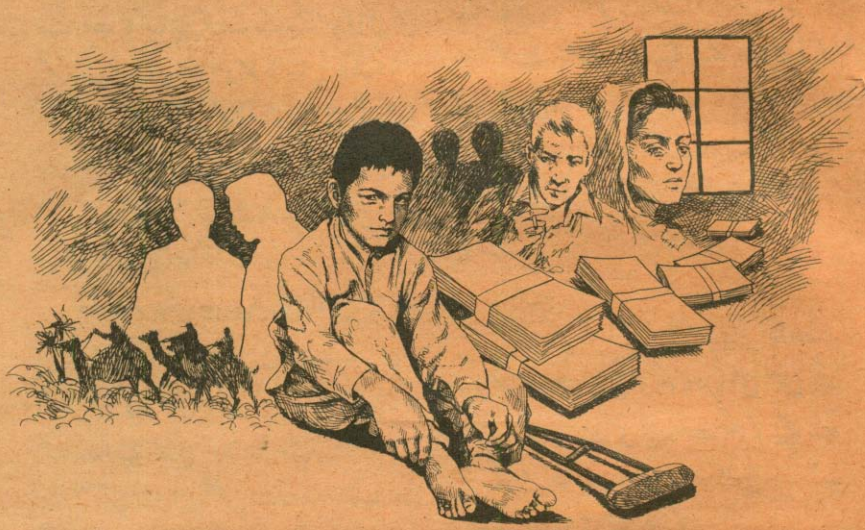

کاش میں مزدور نہ ہوتا

خلیل جبار

برتن کے بجنے کی آواز پر عاقل کی آنکھ کھل گئی۔ صحن میں موجود باورچی خانے میں اس کی والدہ کھانا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ کھانے کی خوشبو سے اس کے خالی پیٹ میں بھوک کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔

"امی مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" نوید نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"صبر کر ابھی کسی نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔"

"امی مجھے بھی بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" شاہد نے بستر میں سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

"بھئی اپنی امی کو اتنا پریشان مت کرو، کھانا تیار ہو جائے گا تو سب کو مل جائے گا۔" ان کے والد نے بچوں کو بھوک سے بلبلاتا دیکھ کر کہا۔

احمد ضلع گجرات کا رہنے والا تھا۔ وہ مزدور آدمی تھا۔ گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ کئی بار تو مزدوری نہ ملنے پر بچوں کو بھوکا سونا پڑتا تھا۔ آج وہ مزدوری کر کے رات گئے لوٹا تھا۔ خوش قسمتی سے آج ایک سبزی کی دکان کھلی ہوئی تھی اس

لئے رات کا کھانا تیار کرنے کے لئے سبزی مل گئی تھی ورنہ آج بھی بچوں کو بھوکا سونا پڑ جاتا۔

"آؤ عاقل تم بھی کھانا کھالو۔" اس کی والدہ نے بچوں کو کھانا دیتے ہوئے عاقل کو آواز دی۔

"اچھا امی۔" یہ کہتے ہوئے عاقل اپنی بے ساکھی کا سہارا لیتا ہوا کھڑا ہوا۔

کھانا کھا کر عاقل جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ رات کے کسی پہر پیاس کی شدت سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ابھی وہ چارپائی سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اسے اپنے والد کی آواز سنائی دی۔

"آج میری اس شخص سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔"

"پھر؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم اپنے کسی چھوٹے بچے کو بیچ دو تو میں تمہیں پچاس ہزار روپے دلوا سکتا ہوں۔"

"مگر ہم اپنے بچے کو کیوں بیچیں؟"

"ہم اپنے دل پر پتھر رکھ کر ایک بچے کو بیچ دیں تو ہمارے پاس پچاس ہزار روپے آجائیں گے ان سے میں کوئی کاروبار کر سکتا ہوں۔ سوچو یہ بچے جو بھوک سے بلبلاتے رہتے ہیں پیٹ بھر کر تین وقت کا کھانا کھا سکیں گے۔ ان کا مستقبل سنور سکتا ہے۔"

"وہ بچے کو خرید کر کیا کریں گے؟"

"کرنا کیا ہے عرب ممالک میں اونٹوں کی ریس لگتی ہے وہ اونٹوں پر بچوں کو سوار کر کے اونٹوں کو دوڑاتے ہیں۔" احمد نے کہا۔

"اتنے معمولی کام کے لئے وہ بچوں کو خریدتے ہیں۔"

"ہاں وہ اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔"

"تو کیا واقعی تم نے اپنے بچے کو بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ہاں۔"

"میں کبھی بھی اپنے بچے کو بیچنے کی اجازت نہ دیتی مگر میں ان بچوں کو بھوکا مرتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اگر میرے کسی ایک لختِ جگر کو بیچنے سے اس گھر میں خوشیاں آسکتی ہیں تو بھلے بیچ دو۔" یہ کہتے ہوئے ماں کی آواز بھرا گئی۔

"دیکھ زینب اپنے بچے کون خوشی سے بیچ سکتا ہے۔ مگر کیا کروں اولاد کو بھوک سے بلکتا ہوا بھی تو نہیں دیکھ سکتا نا۔" احمد نے وضاحت کرنا چاہی۔

"تم کس کو بیچنا چاہتے ہو؟" ماں نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ عاقل کو بیچ دوں، یہ ویسے بھی اپاہج تو ہے ہی..... اچھا ہے اس کی زندگی بن جائے گی اور ہماری بھی۔"

"تو کیا ابا مجھے بیچ رہا ہے؟" عاقل کو ایک جھٹکا لگا۔ "میرا اپاہج ہونا اس قدر بُرا ہے۔ محلے کے لوگ تو میری معذوری کا مذاق اڑاتے ہی تھے آج احساس ہوا ہے کہ ابا کو بھی میرا معذور ہونا اچھا نہیں لگتا۔ وہ جبھی مجھ سے تنگ ہیں۔ مجھے بیچ کر وہ امیر

آدمی بن جائیں گے۔ میرے بہن بھائی اچھے اور مزیدار کھانے کھایا کریں گے۔" عاقل کے ذہن میں خیالات کا طوفان اٹھتا رہا اور وہ رات بھر روتا رہا۔ روتے روتے اس کی دوبارہ آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو ابا مزدوری پہ جا چکا تھا۔ وہ جب تیار ہو کر ناشتے کے لئے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ماں کافی پریشان دکھائی دے رہی ہے۔ جب اس نے ناشتہ کر لیا تو ماں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"عاقل بیٹا! تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔

"مجھے پتا ہے ماں! تجھے کیا بات کرنی ہے۔" عاقل نے پانی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"تجھے معلوم ہے!" ماں کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "مگر کیسے؟"

"میں نے رات کو ہونے والی گفتگو سن لی تھی، اگر ابا سمجھتا ہے کہ میرے بیچ دینے سے اس گھر میں خوشیاں آ سکتی ہیں تو بھلے بیچ دے۔" عاقل نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پپوٹے بند کر کے جذب کرنے کی کوشش کی مگر آنسو آنکھوں سے باہر چھلک ہی پڑے۔

"دیکھ بیٹے عاقل! پریشان مت ہونا، تجھے لے جانے والے تیرا بڑا خیال رکھیں گے۔" ماں نے کہا اور کہتے کہتے رو پڑی۔

"اور جب وہ لوگ تجھے لینے آئیں تو ان کے سامنے مت رونا ورنہ تیرے ابا کو سخت تکلیف ہوگی میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟"

مزار اقبال

مزار اقبال کا ڈیزائن حیدر آباد کے مشہور ماہر تعمیرات "زین یار جنگ" نے بنایا۔ مزار اقبال کی تعمیر کا آغاز ۱۹۴۶ میں ہوا اور اس کا اختتام فروری ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ مزار کی تعمیر کے لئے جناب بشیر احمد انچارج انجینئر نے اپنی خدمات بطور رضاکارانہ وقف کر دیں۔ مزار اقبال" پر تقریباً ایک لاکھ روپیہ لاگت آئی اور یہ لاگت حکیم الامت کے مداحوں، خیر خواہوں اور عقیدت مندوں کی نجی کوششوں سے پوری ہوئی تھی۔ مزار اقبال اندر سے سنگ مرمر اور باہر سے سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ مزار اقبال کی تعمیر کے سلسلے میں تشکیل دی گئی کمیٹی کے منتخب ارکان ترتیب وار یہ تھے. صدر، چوہدری محمد حسین سیکرٹری، خواجہ عبد الرحیم اور حکیم قرشی، دیگر ارکان میاں امیر الدین، راجہ حسن اختر، حمید نظامی اور شیخ محبوب الٰہی تھے۔ مزار اقبال کی لوح اور تعویز حکومت افغانستان نے بھیجی تھی اور مزار کا تعویز و کتبہ دنیا کے سب سے قیمتی پتھر (LAPISLAZ-ULI) سے بنایا گیا ہے۔ مزار" کی چھت کے وسط میں اسم "محمدؐ" کندہ ہے اور چاروں گوشوں میں اقبال" کا اپنا نام اس انداز میں ہے کہ ہر ایک نام کی برقی لہر مرکز "محمدؐ" کی طرف مائل ہے۔ جس سے یہ اظہار مقصود ہے کہ اقبال نے جس مرکز انوار سے اکتساب نور کیا وہ ذات پاک نبی کریمؐ کی ہے اور انہیؐ کی الہامی تعلیمات کا پرتو علامہ" صاحب کے کلام اور پیغام پر پڑا۔ مزار کے کل دو دروازے ہیں ایک مشرقی جانب دوسرا جنوبی جانب اور مغربی جانب ایک کھڑکی ہے جو سنگ مرمر کی جالی سے بند کی ہوئی ہے۔ مزار اقبال" کے دونوں داخلی دروازے سنگ مرمر کی حسین جالیوں سے بنے ہوئے ہیں۔ مزار کے پتھر "راجپوتانہ" سے درآمد کئے گئے تھے۔

"ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔" عاقل نے ایک سرد آہ بھری۔

عاقل صبح سے حسرت بھری نگاہ سے گھر کی ایک ایک چیز دیکھ رہا تھا۔ شاہد جو صحن میں لیک چھوٹے سے پتھر کو گیند سمجھ کر کھیل رہا تھا اپنے چھوٹے بھائی کو اداس دیکھ کر اس کے پاس آیا۔

"کیا بات ہے عاقل؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے بھیا۔"

"تو پھر ابا کو منع کر دو۔"

"نہیں! میرا چلا جانا ہی اچھا ہے۔ تم لوگوں کو خوب اچھے اچھے کھانے تو ملا کریں گے۔"

"ہاں جبھی تو ابا تمہیں بیچ رہا ہے۔" شاہد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جب تم اچھے اچھے کھانے کھایا کرو گے تو مجھے یاد کرو گے نا؟" یہ کہتے ہوئے عاقل کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اتنے میں باہر سے ابا کی آواز آئی۔ وہ شاہد سے عاقل کو باہر لانے کے لئے کہہ رہے تھے۔

عاقل آواز سن کر بے ساکھیوں کا سہارا لیتا ہوا باہر کی طرف چل پڑا۔ باہر دو اجنبی کھڑے تھے۔ وہ عاقل کو دیکھ کر چونکے۔

"یہ..... یہ بچہ ہے۔"

"ہاں یہی ہے۔" عاقل کو لگا کہ ابا سخت گھبرایا ہوا تھا۔

"نہیں..... یہ نہیں چلے گا۔" ایک نے بڑی رکھائی سے کہا۔

"کیوں نہیں چلے گا۔" ابا نے ایسے کہا جیسے ان کی بڑی قیمتی چیز کو ٹھکرا دیا گیا ہو۔

"ہمیں صحت مند بچہ چاہئے۔" دوسرا بولا۔

"اچھا تو پھر اسے لے جاؤ۔" ابا نے شاہد کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

"نہیں یہ بڑا ہے۔"

"چلے جاؤ! بھاگ جاؤ یہاں سے تم لوگ۔" ابا پھٹ پڑا۔ "مجھے نہیں بیچنا ہے اپنا کوئی بچہ وچہ۔" ابا چیخ رہا تھا۔ دونوں اجنبی حیران پریشان وہاں سے کھسک لئے۔

جب ابا گھر کے اندر چلا گیا تو شاہد نے عاقل سے کہا۔

"چلو اچھا ہوا اب تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔" عاقل چپ رہا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھوڑی دیر بعد بولا۔

"بھیا! میں معذور نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ لوگ مجھے خرید کر لے جاتے اور تم سب کو مزے مزے کے کھانے ملتے۔"

سرخ اور نیلے رنگ کے اولے

پروفیسر شیڈاف نے رسالہ "فلاسفی" کی ۱۴ جون ۱۸۸۰ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ دنیا میں ایک دو جگہ سرخ اور نیلے رنگ کے اولے بھی گرے۔

عبدالاحد عرفان

ترجمہ: اقبال جہاں فاروقی

عجیب ہیں کھیل قدرت کے

لوری شیپل اور ڈوری شیپل دو جڑواں بہنیں ہیں۔ جن کا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا قدرت نے گزشتہ ۳۱ برس سے ایک ساتھ کردیا ہے۔ وہ ہر وقت ایک دوسرے سے آگے پروگرام کے بارے میں مشورہ کرتی رہتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

ان کے جسم الگ ہیں، دماغ الگ ہیں لیکن سراس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ اُن کے چہرے مختلف سمتوں میں ہیں اور انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے آئینہ درمیان میں رکھنا پڑتا ہے دوستوں سے باتیں کرتے ہوتے بار بار گھومنا پڑتا ہے۔ ۳۱ برس قبل جب یہ دونوں جڑواں بہنیں پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے جان کے خطرے کے پیش نظر آپریشن کے ذریعے دونوں کو علیحدہ کرنے کی تجویز مسترد کردی لیکن اب دونوں لڑکیوں نے اٹھنا بیٹھنا سیکھ لیا ہے وہ کہتی ہیں "یہی ہماری زندگی ہے" ڈاکٹر اب بھی آپریشن کرکے دونوں کو علیحدہ کرسکتے ہیں لیکن اب دونوں بہنیں اٹھتا ہی رہنا چاہتی ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپریشن کی فیس بہت زیادہ ہوگی دوسرے زندگی کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔

دونوں بہنیں جڑواں ہونے اور ۳۱ برس اکٹھے گزارنے کے باوجود مختلف مشاغل رکھتی ہیں۔ ڈوری گلوکاری کی جانب مائل ہے جبکہ لوری ایک اسپتال میں کام کرتی ہے۔ جب ڈوری سڑکوں پر گانا گانے نکلتی ہے تو لوری صبر کے ساتھ اس کے ساتھ جاتی ہے اور لوری کے اسپتال میں ڈیوٹی کے دوران ڈوری کتابیں پڑھتی ہے ان کے الگ الگ دوست ہیں اور زندگی کے بارے میں نظریات بھی۔ لوری چاہتی ہے کہ اس کے بچے ہوں جبکہ ڈوری بچے پیدا نہیں کرنا چاہتی ہے۔ دونوں بہنوں کا کہنا ہے کہ ہم دو الگ الگ شخصیتوں کے مالک ہیں۔

کیچپ تو صِرف

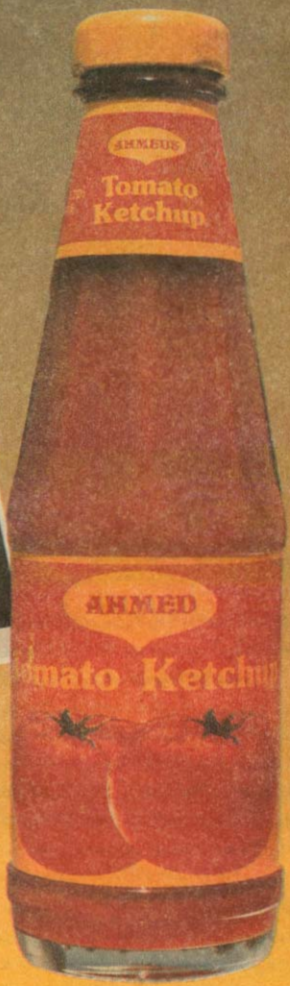

احمد

ٹماٹو کیچپ

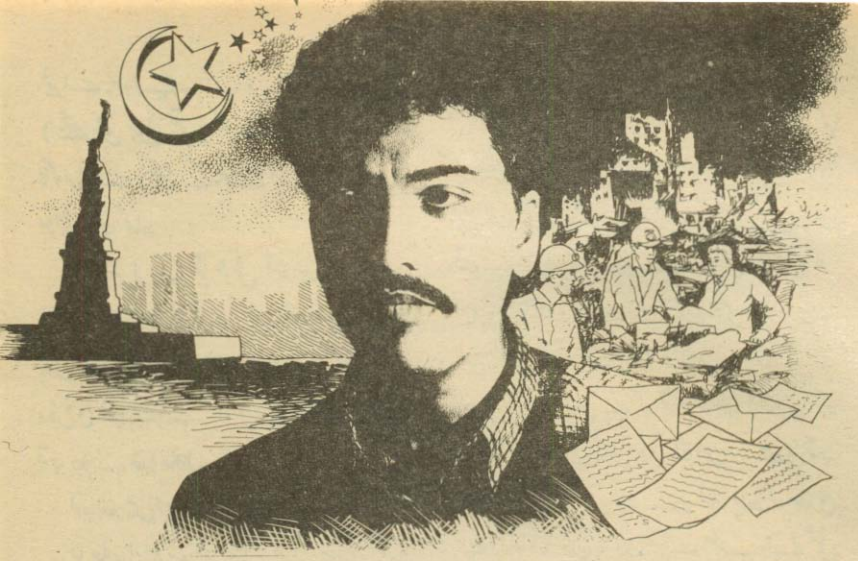

فیصلہ

رئیس احمد مغل

یکم دسمبر ترانوے/ شکاگو، امریکہ

پیارے ابا جان ..... السلام علیکم!

وعدہ کے مطابق یہاں پہنچتے ہی آپ کو فون کر دیا تھا اور اب گھر کی سیٹنگ وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے یہاں امریکہ آئے ایک ہی ہفتہ ہوا ہے لیکن اس ایک ہفتہ میں ہی جو تعارف ہوا ہے اس نے مجھے امریکا کا دیوانہ بنا دیا ہے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے میں نے امریکہ کی زندگی کے متعلق جو کچھ سنا تھا خوبیوں میں امریکہ کو اس سے بڑھ کر پایا۔ اپنے ملک میں رہتے ہوئے یہ سننا کہ امریکہ میں سب چیزیں خالص ملتی ہیں اور بات ہے جب کہ یہاں آ کر اس کا تجربہ کرنا بالکل مختلف بات ہے۔ خالص دودھ جو اٹھائیس سال میں، مَیں پاکستان میں کہیں نہ دیکھ سکا۔ امریکہ آ کر دیکھا اور پایا۔ بلکہ اب تو ملاوٹ والا دودھ دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس رہی ہیں۔ یہی حال مصالحہ جات اور دیگر اشیاء کا ہے۔ لیکن

خیر اسے چھوڑیئے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی (مجھے بھی ہوئی تھی) کہ یہاں میری بیساکھی کو ناگواری سے دیکھنے کے بجائے ایک افسر نے خوش مزاجی سے کہا۔

"مسٹر اریب تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں "خصوصی" ہونے کی وجہ سے خاص سہولتیں میسر ہوں گی اور ویسے بھی ہمیں تمہارے جسم کی نہیں دماغ کی ضرورت ہے۔ خوش رہو..... اپنے کام پر توجہ دو..... خدا حافظ۔"

اور بعد میں اس افسر کی بات صحیح ثابت ہوئی۔

ابا جان! امریکہ میں، مَیں خوش ہوں، بہت خوش۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میرے خوابوں کی سرزمین مجھے مل گئی اور دوسری خوشی اس بات کی ہے کہ میرے خواب غلط نہ تھے (جیسا کہ آپ کو خدشہ تھا) امریکہ، امریکہ ہے اور میرے مزاج کے مطابق ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنی دعاؤں میں نہیں بھولیں گے۔ گھر کے باقی سب افراد کے نام الگ الگ خط اس لفافہ میں بھیج رہا ہوں۔ سب کو تاکید کیجئے کہ جواب آج ہی دیں اور آپ خود بھی ایسا ہی کیجئے گا۔

والسلام

آپ کا برخوردار

اریب فائق

سترہ دسمبر ترانوے/ شکاگو

پیارے ابا جان..... السلام علیکم

آپ کا خط ملا لکھا ہے کہ میں اپنے روزانہ کے معمول لکھوں اور بتاؤں کہ میری نمازوں کی کیا پوزیشن ہے؟ تو پیارے ابا جان نمازیں اگرچہ پاکستان میں ہی مجھ سے قضا ہو جاتی تھیں لیکن یہاں قدرے بہتر صورت حال ہے۔ صبح کی نماز میں گھر ہی پر پڑھتا ہوں۔ بعد میں تلاوت بھی کرتا ہوں۔ البتہ ظہر کی نماز دفتر میں ادا کرتا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ تمام تر خود اعتمادی کے باوجود انگریزوں کی چبھتی ہوئی نگاہیں میری توجہ بھٹکا دیتی ہیں اور میں غلط سلط نماز پڑھ کر جلدی سے دعا مانگتا ہوں۔ در حقیقت مغرب والے عملی زندگی میں مذہب سے اتنے ہو گئے ہیں کہ نئی نسل مذہب کو "غیر مفید" قرار دے کر جدید علوم و فنون پر توجہ دیتی ہے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ابھی مجھ میں اتنا اعتماد پیدا نہیں ہوا۔ امید ہے کہ ایک دن ضرور آئے گا جب میں انگریزوں کو نماز کی افادیت بتاؤں گا۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیے۔

دوپہر عصر تک دفتر ہوتا ہے۔ عصر کی نماز گھر میں سکون دل کے ساتھ پڑھتا ہوں اور لباس تبدیل کر کے سیر کو نکلتا ہوں۔

نماز مغرب اسی سیر کے دوران اور عشاء گھر پر پڑھتا ہوں۔ اتوار کو چھٹی ہوتی ہے۔ چھٹی کا دن میں اپنے پرانے طرز پر یعنی سو کر گزارتا ہوں۔ شام کو البتہ چہل پہل دیکھنے کے لئے نکل جاتا ہوں اور ہفتہ بھر کے لئے خریداری بھی کر لیتا ہوں۔

گزشتہ خط میں، میں نے امریکہ کا مختصراً ذکر کیا تھا، اب کچھ ذکر امریکیوں کا! امریکی دنیا کی ایک بالکل مختلف مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امریکیوں کو ایک صفت سے خوب نوازا ہے اور وہ ہے بے پرواہی! لیکن یہ بے پرواہی منفی بے پرواہی نہیں ہوتی کہ یہ لوگ اپنے فرض سے بے پروا ہو جائیں۔ بلکہ حقیقتاً وہ اپنے فرض کے علاوہ ہر چیز سے بے پروا ہوتے ہیں۔ امریکی اپنے حقوق سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کا دفاع کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ جرأت اظہار اور رائے کا احترام کرنا امریکیوں بلکہ تمام یورپینوں (جن سے میں ابھی تک مل پایا ہوں) میں انتہائی زیادہ ہے۔ امریکہ میں ایک عجیب طرح کی آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ امریکہ، شخصی آزادی کا حامی ہے اور بالکل درست طور پر اس کا حق دار ہے۔ میں نے جب اس کا مقابلہ پاکستان سے کیا تو میرے ذہن میں تمام مسائل کا ایک ہی حل اور ایک ہی وجہ آئی۔ پاکستان کے جتنے بھی مسائل ہیں (اور پاکستان کے مسائل پر سنجیدگی سے سوچنے کا موقع مجھے یہاں ملا ہے) ان سب کا حل "خواندگی" ہے۔ میں نے یہاں کے ایک اخبار میں پاکستان کے اعلیٰ حکام کے نام خط لکھا ہے جس میں، میں نے لکھا ہے کہ آپ تعلیمی بجٹ کو دوگنا کر دیں..... اور صحیح تعلیمی نظام بنالیں تو دس سالوں میں آپ کو دفاعی بجٹ پر ایک روپیہ بھی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

خط کافی طویل ہو گیا اور مجھے بھی احساس ہے کہ آپ امریکہ کا کافی ذکر سن چکے بلکہ برداشت کر چکے ہیں۔ اگلے خط تک اجازت، گھر میں سب کو خط لکھنے کی تاکید کر دیجئے۔ والسلام

آپ کا برخوردار
اریب فائق

۴ جنوری ۹۴/ لاس اینجلس

پیارے ابا جان..... السلام علیکم!

اگر یہ بات آپ کے مزاج کے موافق ہوتی تو میں ضرور آپ کو نئے سال کی مبارک باد دیتا ہے۔ یہاں نئے سال کی مبارک باد دے دے کر اور وصول کر کر کے حلق خشک ہو گیا۔ کرسمس اور نئے سال کا استقبال جس طرح امریکہ میں ہوتا ہے اس کا اندازہ پاکستان میں بیٹھے ہوئے "ٹائم" اور "نیوز ویک" پڑھ کر لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ مجھے پہلی بار دیکھنے کو ملا کہ امریکی جو مذہب سے اس قدر دور نظر آتے ہیں کرسمس، کے موقع پر کس قدر مذہبی بن جاتے ہیں۔ کرسمس اور نئے سال کے جشن کو امریکیوں نے کچھ اس طریقے سے منایا کہ مجھے اپنی عید کے پھیکا ہونے کا احساس ہوا۔ ہم مسلمان عید کا تہوار مناتے ہی نہیں۔ میں خود یاد کر کے شرم محسوس کر رہا ہوں کہ عید کا دن میں سو کر گزارتا تھا۔ کرسمس کے موقع پر غریبوں کی جس بڑے پیمانے پر مدد کی جاتی ہے اس کے مقابلے میں مجھے اپنی عیدیاں اور صدقات انتہائی کم محسوس

ہوئے۔ اباجان ایک بات جو میں کافی دیر سے کہنے کے لئے ہمت اکٹھی کر رہا ہوں، (جو شاید آپ کو اچھی نہ لگے) یہ ہے کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مستقل طور پر امریکہ میں رہائش اختیار کروں اور امریکی شہریت حاصل کر لوں۔ مجھے احساس ہے کہ میرے اس فیصلے سے آپ کو کافی دکھ ہوگا، لیکن میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے انتہائی پر سکون ہوں اور میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں امریکی شہریت اس لئے حاصل نہیں کر رہا کہ پاکستان سے مجھے نفرت ہے یا خدانخواستہ پاکستان رہنے کے قابل نہیں رہا، بلکہ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ میری صلاحیتیں پاکستان میں نہیں پنپ سکتیں اور نہ وہ ماحول میرا ذہن قبول کرتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا خمیر اللہ تعالیٰ نے امریکہ سے لیا تھا۔ مجھے پاکستان پر فخر ہے اس نے ہی مجھے اس قابل بنایا کہ میں امریکہ آسکوں۔ مجھے پاکستان کے لوک گیت نہیں بھول سکتے لیکن جب مائیکل جیکسن کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو مجھے اس کی ہر دھمک، ہر لفظ اپنے دل کی آواز محسوس ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان پر اس لئے فخر ہے کہ اس نے مجھے مسلمان بنایا۔ آج اگر میں مسلمان نہ ہوتا تو شاید امریکیوں کی طرح روحانی بے چینی کا شکار ہوتا۔ لیکن امریکہ میری مٹی ہے اور میرا فیصلہ ہے کہ میری مٹی اس مٹی میں مل کر ختم ہوگی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بچپن میں مجھے کہا کرتے تھے کہ جس بات پر ضمیر مطمئن ہو وہ فیصلہ بالکل درست ہوتا ہے چاہے ذہن میں جتنے شکوک و شبہات پیدا ہوں۔ اس فیصلے سے میرا ضمیر مکمل طور پر مطمئن ہے مجھے بس صرف ایک بات کا دکھ ہے اور وہ ہے آپ کے دکھ کا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ میری گستاخی معاف کریں گے اور میرے فیصلے کا زیادہ اثر نہیں لیں گے اور اپنی صحت کا خیال رکھیں گے۔

والسلام

آپ کا برخوردار

اریب فائق

۳۰ جنوری / نیو یارک

پیارے اباجان ...... السلام علیکم

جیسا کہ آپ کو اب تک پاکستانی سفارت خانہ کی جانب سے اطلاع مل چکی ہوگی کہ میں لاس اینجلس کے خوف ناک زلزلے سے زندہ بچ گیا ہوں اور نیو یارک کے ایک ہسپتال منتقل کیا گیا ہوں۔ اس خط لکھنے کا مقصد تفصیل سے آپ کو اپنے حالات اور احساسات سے آگاہ کرنا ہے۔

لاس اینجلس کے زلزلے کے وقت میں اپنے آفس میں تھا۔ ابتدائی جھٹکوں پر ہی سب نے بھاگنے کی کوشش کی، مجھے بھاگنے میں دقّت ہوئی کیونکہ جب تک میں نے بیساکھی سنبھالی دفتر کا ایک حصہ زمین بوس ہو چکا تھا۔ میں جوں ہی اپنے کمرے سے باہر نکلا مجھے اپنے ساتھیوں کے دھکے کھانے پڑے۔ خیر یہ تو ہونا تھا۔ اپنی جان بچانے

کے لئے انسان ہمیشہ دوسروں کو موت کے گڑھے میں دھکیلتا ہے۔ اور اضطراری حالت میں ایسا ہونا عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ لیکن میں جب کسی طرح دفتر سے باہر نکلا، ہمارے دفتر کے سامنے والی عمارت زمین کی طرف تیزی سے جا رہی تھی اور اس وقت مجھے ایک دھکا لگا اور .... پھر جب ہوش آیا تو آدھی رات تھی۔ لاس اینجلس کی سرد اور یخ بستہ رات، میری حالت یہ تھی کہ میرا نچلا دھڑ ملبے میں دبا ہوا تھا اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ درد کی شدت سے میں نے اپنے ہونٹ اس قدر بھینچ لئے تھے کہ ان سے خون نکل آیا۔ (ان پر ڈاکٹر صاحبان نے اب ٹانکے لگائے ہوئے ہیں) اس غضب کی سردی میں میرا باقی آدھا جسم سن ہو چکا تھا اور میرے ہاتھ اور سینہ شدید زخمی تھے۔ جب ٹھنڈی ہوا ان سے آکر ٹکراتی تو تکلیف کی شدت سے میں رو کر اپنی موت کی دعا مانگنے لگتا۔ مجھے صبح تک اپنی اکڑی ہوئی لاش کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر سے اس حالت میں تھا کہ مجھے دور ٹارچوں کی روشنیاں دائروں میں حرکت کرتی محسوس ہوئیں۔ میں اس وقت کی مسرت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں مسرت کی زیادتی اور زبان کے سن ہونے کی وجہ سے آواز تک نہیں نکال پا رہا تھا لیکن یہ بات میرے لئے کافی تھی کہ ٹارچ والے میری جانب ہی بڑھ رہے تھے اور جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ امدادی ٹیم مجھ تک پہنچ گئی اور پھر اس لمحے کی خوشی جب ٹارچ کی روشنی ایک شخص نے میرے چہرے پر ڈالی اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن اس کی بات سُن کر میں ہڈیاں تک سُن ہو گئیں۔ اس نے انتہائی بے زاری سے کہا۔

"Not American"

اور آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک انگریز کی لاش دیکھ اور جلدی جلدی اسے ملبے سے نکالنے لگے۔ مجھ پر دکھ کی شدت سے، غم کی زیادتی سے سکتہ ہو گیا۔ یہ ہے امریکہ! یہ ہیں امریکی!؟

نظم و ضبط، قانون، اعلیٰ تعلیم، شخصی آزادی، جمہوریت اور احترام انسانیت، ان الفاظ کے معانی میرے ذہن سے اتر گئے۔ میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ الفاظ کس لئے استعمال ہوتے ہیں۔ انسانیت .... کیا یہی ہے انسانیت کہ ایک لاش کو ملبے سے فوراً نکالا جائے اور ورثاء تک پہنچایا جائے کیونکہ وہ امریکی کی لاش ہے۔ اور ایک زندہ شخص کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ وہ امریکی نہیں ہے۔ وہ امریکی نہیں ہے اس لئے کسی اہمیت اور فوری مدد کا مستحق بھی نہیں ہے۔

اور میرا سکتہ خود میری اپنی چیختی آوازوں سے ٹوٹا۔ میرے اندر آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار دل کھول کر گالیاں دیں۔ انہیں اخلاقیات اور انسانیت کے قاتل قرار دیا اور جانے کیا کچھ کہا اور پھر میری یادداشت میں صرف اتنا باقی ہے کہ ان میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر میرے

اچھے کھیل سے ملک اور قوم کا نام روشن ہوتا ہے۔ جیسے کرکٹ میں پاکستان عالمی چمپئن ہے اور اسکواش کے کھیل میں بھی پاکستانی کھلاڑیوں کی کارکردگی ہمیشہ شاندار رہی ہے۔ ان دونوں کھیلوں کی وجہ سے پاکستان کا نام خوب روشن ہوا ہے۔ بچے ناپسند کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ عید کی آمد آمد ہے، اس وجہ سے ہم نے سوچا کیوں نہ کھلاڑیوں سے عید منانے کے متعلق پوچھا جائے۔ اسی سلسلے میں ہماری چند کھلاڑیوں سے گفتگو ہوئی جو درج ذیل ہے۔

جاوید میانداد: میں جب بھی پاکستان میں رہتا ہوں، عید اپنی امی کے ساتھ مناتا ہوں۔ عید کے دن عجب سماں ہوتا ہے، رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح جلدی اٹھنے کو دل نہیں چاہتا لیکن امی زبردستی اٹھا دیتی ہیں۔ اب تو امی پر ڈبل ذمہ داری ہے پہلے تو انہیں صرف مجھے اٹھانا پڑتا تھا لیکن اب میرے ساتھ ساتھ میرے بچوں کو بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ امی کی پرانی عادت ہے کہ وہ ہمارے نماز پڑھنے کے لئے جانے سے قبل دودھ سویّاں ضرور کھلاتی ہیں۔ اب تو میں خود بچوں والا ہوں لیکن امی کی نظر میں. میں اب بھی چھوٹا سا جاوید ہوں۔

سر پر بھاری بوٹ سے ایک ٹھوکر لگائی اور اندھیرا چھا گیا۔ پھر میری آنکھ ہسپتال میں کھلی جہاں سے مجھے پاکستانی سفارت خانہ نے نیو یارک کے ہسپتال میں منتقل کیا۔

ابا جان میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ نے منع کیا تھا لیکن میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ جلد بازی میں فیصلے کرنا میری عادت بن گئی ہے۔ تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی پاکستان آنے والی پہلی فلائٹ میں بیٹھنا ہے۔ میری دوسری ٹانگ جو مجھے امریکہ لائی تھی میں امریکہ میں ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔ غالباً میری اس ٹانگ کا خمیر امریکہ سے اٹھا تھا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ پاکستان مجھے دونوں بیساکھیوں کے ساتھ قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کرے گا۔ میں اس وقت ذہن پر انتہائی زور ڈالنے کے باوجود بھی مائیکل جیکسن کا حلیہ یاد نہیں کر پا رہا ہوں۔ البتہ میرے تصور میں ایک سمارٹ سا نوجوان، پینٹ شرٹ پہنے ابھر رہا ہے۔ ہاں غالباً اس کا نام جنید ہے اور یہ دل کی گہرائیوں سے گا رہا ہے۔ دل دل پاکستان! جاں جاں پاکستان! اور اس کے زیر و بم پر میرا دل دھڑک رہا ہے۔

۳۱ مختلف قسموں کے پتوں والا درخت

بمبئی کے رہنے والے بھارتی بحریہ کے ایک ریٹائرڈ افسر مائیکل نے ۱۸ سال کی طویل جدوجہد کے بعد ایک ہی تنے سے پھوٹے ہوئے ۳۱ مختلف کے پتوں والا ہرا بھرا ایک درخت اگایا ہے۔ اور اسے قومی ایجاد کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ اس درخت کی ٹہنیوں کی پیوند کاری اس انداز سے کی گئی ہے کہ یہ درخت بھارت کا نقشہ بن گیا ہے۔ درخت کے ۳۱ پتے بھارت کی ۲۲ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام ۹ علاقوں کی علامت ہے۔ یہ درخت انہوں نے اپنے گھر میں ایک گملے میں اگایا ہے۔ مائیکل نے گوا میں اپنی ملازمت کے دوران کافی تلاش کے بعد بھارت کے نقشے سے مشابہ ایک شاخ تلاش کی اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد پیوند کاری کا فن سیکھا۔ ۱۹۸۴ میں مائیکل نے یہ درخت مکمل کیا۔

روشنی والا درخت

ایک چینی کسان کو ایک ایسا درخت ملا ہے جس سے اتنی روشنی پھوٹتی ہے کہ رات کے وقت اس کا گھر روشن ہو جاتا ہے۔ اس کسان نے جب اس کی چھال اتاری تو اسے نیلے رنگ کی روشنی نکلتی نظر آئی

وسیم اکرم: زیادہ تر عیدیں تو وطن سے باہر ہی گزرتی ہیں لیکن عید منانے کا اصل مزا تو گھر والوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ہے۔ خوب عیدی ملتی ہے۔ بہن بھائی ایک دوسرے سے پیسے چھینتے ہیں، کسی کو زیادہ پیسے مل جائیں تو گتھم گتھا بھی ہو جاتی ہے۔ میں جب کرکٹ میں زیادہ مصروف نہ تھا تو عید منانے کا بڑا مزا آتا تھا۔ امی جب صبح صبح ہم بہن بھائیوں کو جگاتیں تو کوئی کہتا کہ پہلے دوسرے کو اٹھائیں، میں ابھی اٹھتا ہوں۔ امی جب مجھے اٹھانے آتیں تو میں کہتا کہ میں رات کو دیر سے سویا ہوں اس لئے دیر سے اٹھوں گا۔ اس پر امی مجھے ڈانٹتیں وسیم سیدھی طرح اٹھ جاؤ ورنہ!

اور اس ورنہ کا مطلب میں اچھی طرح جانتا تھا اس لئے فوراً اٹھ جاتا تھا اور پھر ہم سب بھائی تیار ہو کر ابو کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔

لیکن اب تو یہ سب خواب سا لگتا ہے۔ اب تو عید کے دن بھی ہم لوگ دیار غیر میں کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں۔

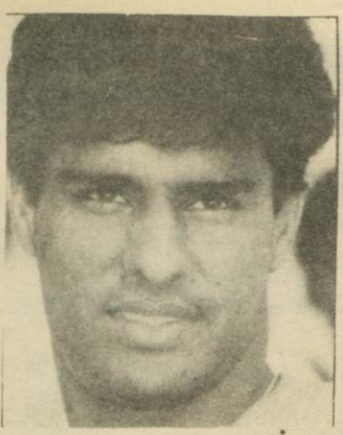

وقار یونس: میرا بچپن شارجہ میں گزرا ہے، میرے والد وہیں ملازمت کرتے تھے اس لئے ہم وہیں رہتے تھے۔ جب ہم شارجہ میں تھے تو عید منانے کا مزا ہی اور تھا۔ پانچ چھ دن پہلے اسکول بند ہو جاتے تھے اور ہم لوگ خوب مزے کرتے تھے۔ لیکن اب تو صرف کرکٹ ہی کرکٹ ہے۔

رمیز راجہ: سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اس بار عید گھر پر امی، ابو، بیگم اور بچوں کے ساتھ

منانے کا موقع مل رہا ہے۔ پچھلے سال عید ویسٹ انڈیز کے شہر پورٹ آف اسپین میں منائی تھی۔ نماز بھی پڑھنے گئے تھے لیکن شیر خرما کھانے کو نہیں ملا تھا۔ میں نے گھر والوں کو فون کر کے عید کی مبارک باد دی تھی۔ بچوں سے باتیں کر کے ہی منہ میٹھا کر لیا تھا۔ ہماری زندگی میں تو اتنی مصروفیت ہوگئی ہے کہ ہر وقت کرکٹ ہی کھیلتے رہتے ہیں۔ اس کرکٹ نے تو عید تہوار ہی بھلا دیئے ہیں۔

سلیم ملک: میں عید اپنے گھر پر سادگی سے مناتا ہوں۔ پچھلی عید پر میں بہت اداس تھا کیونکہ میرے والد مجھے چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ تب مجھے احساس ہوا تھا کہ ماں باپ کا سایہ کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ تھے تو گھر کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مہینوں گھر سے باہر رہتے تھے لیکن آسرا ہوتا تھا کہ والد گھر پر موجود ہیں لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ دعا کریں کہ میری یہ عید اچھی گزرے۔

دلچسپ ریکارڈز

چار کرکٹر جو ایک آنکھ کی معذوری کے باوجود کھیلتے رہے

۱۔ رانجی، جن کی ایک آنکھ شوٹنگ کے ایک حادثہ میں ۱۹۱۵ء میں ضائع ہوگئی۔

۲۔ ساؤتھ افریقہ کے ای پی نیوین کی ایک آنکھ لڑکپن میں اس وقت ضائع ہوگی جب وہ دو ہتھوڑیوں سے بیک وقت کام کر رہے تھے۔ اس دوران لکڑی کا ایک ٹکڑا ان کی آنکھ پر لگا اس طرح وہ زندگی بھر کے لئے ایک آنکھ سے معذور ہوگئے۔

۳۔ ٹائیگر پٹودی ۱۹۶۱ء میں کار کے حادثہ کے بعد ایک آنکھ کھو بیٹھے۔

۴۔ کالن ملبورن کار کے ایک حادثہ میں اپنی بائیں آنکھ کھو بیٹھے۔

چار کرکٹر بعد کی زندگی میں نابینا ہو گئے۔

۱۔ پرسی فینڈر

۲۔ ولفیرڈ روڈز

۳۔ فل میڈ

۴۔ سیمول مورس

دس بینسمین جو کھیل کے دوران عینک استعمال کرتے تھے یا کرتے ہیں۔

۱۔ پال الاٹ ۲۔ مارٹن رلو کسن ۳۔ ایڈی ہیمنگز ۴۔ کرس ٹیورے ۵۔ جیف بائیکاٹ ۶۔ ظہیر عباس ۷۔ ڈیرک پرنگل ۸۔ لارنس دو ۹۔ انشومن گائیکواڈ ۱۰۔ کلائیو لائیڈ۔

مرسلہ:۔ ناصر حفیظ، ملتان

ھنستے ھنستے

فقیر نے دروازے پر صدا دی تو اندر سے ایک بچہ نکلا۔ اس نے فقیر سے کہا۔

"شربت پیو گے ؟"

"فقیر خوش ہو کر بولا۔ "ہاں! کیوں نہیں۔" بچہ جگ میں شربت لے آیا۔

فقیر نے تیسرا گلاس پینے کے بعد پوچھا۔ "کیا آج گھر میں زیادہ شربت بنا ہے؟"

بچہ معصومیت سے بولا۔ "نہیں دراصل شربت میں مینڈک گر گیا تھا۔"

مرسلہ..... عامر ضیا، کراچی۔

ڈاکٹر۔ "میں تم کو ایسی دوائی دوں گا کہ تم جوان ہو جاؤ گے۔"

مریض۔ "خدارا ایسا ظلم مت کیجئے گا مجھے پینشن ملنے والی ہے۔"

مرسلہ..... راجکمار تلہ ، بخشاپور۔

اورینٹل کالج میں ایک پارٹی تھی جس میں خواتین کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے رہا نہ گیا تو وہ فرمانے لگے۔

"بھئی قحط الرجال تو سننے میں آیا تھا۔ مگر آج قحط النسا بھی دیکھ لیا۔"

مرسلہ..... روبینہ یونس، کراچی۔

باجی:۔ (اخبار پڑھتے ہوئے) "ایک شخص کنویں میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

منا:۔ (سوچتے ہوئے) "بے وقوف جب کنویں میں گرا تھا تو پانی سے ہی ہاتھ دھو لیتا۔"

مرسلہ..... ایم اعجاز احمد، کراچی۔

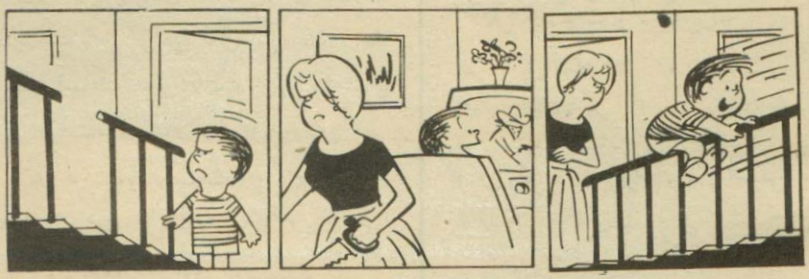

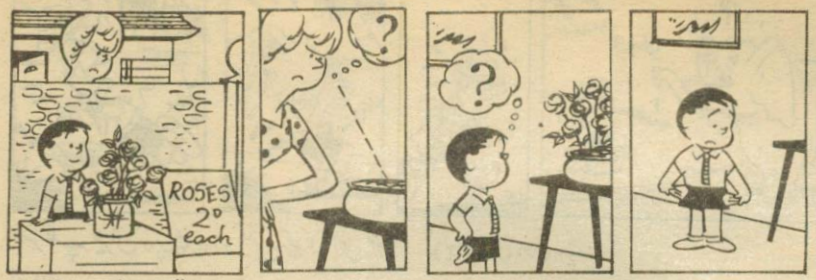

ایک ڈاکٹر صاحب اپنے کلینک میں مریضوں کو دیکھ رہے تھے کہ کسی نے ٹیلی فون کیا۔

ڈاکٹر (ٹیلی فون: کان سے لگا کر) "جی جی..... میں سن رہا ہوں۔ کیا آپ کے بچے نے ریت کھا لی ہے؟"

"ٹھیک ہے میں پہنچ رہا ہوں جب تک آپ اسے سیمنٹ نہ کھانے دیجئے گا۔"

مرسلہ..... محمد ہارون، اسلام آباد۔

ایک نہایت موٹا آدمی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے تانگے والے کو آواز دی۔

"ارے بھئی! بس اسٹاپ چلو گے؟"

تانگے والا بولا۔ "جی ہاں چلوں گا تو سہی پر آپ چپکے سے بیٹھئے گا تاکہ گھوڑے کو پتہ نہ چلے۔"

مرسلہ..... برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔

"امریکی اداکارہ ڈورس ڈلے شروع شروع میں ایک بیکری میں ملازمت کرتی تھی۔ ایک روز دس سالہ بچہ اس کی دکان پر آیا اور ایک پیسٹری خریدنے کے بعد اسے وہیں کھانے لگا۔ پیسٹری کھانے کے بعد اسے غالباً دوسری پیسٹری کی طلب ہوئی لیکن اس کی جیب خالی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے ڈورس ڈلے سے کہا۔ "کیا آپ مجھ سے شادی کر سکتی ہیں؟"

"لیکن ابھی تو تم کمسن ہو۔" ڈورس نے مسکرا کر کہا۔

مم..... مم..... میرا مطلب ہے جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو....."

"یقیناً جب تم جوان ہو جاؤ گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

لڑکا چند لمحوں تک سر جھکائے کھڑا رہا پھر اس نے نگاہ اٹھا کر ڈروس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا آپ اپنے ہونے والے شوہر کو ایک پیسٹری بھی نہیں دے سکتیں؟"

مرسلہ..... فرح طارق، اسلام آباد

فلپ نام کے ایک پادری کو لندن سے ایک افریقی ملک بھیجا گیا وہاں پہنچتے ہی اس نے لندن میں اپنی بیوی کو تار بھیجا۔ اتفاق سے اسی علاقے میں ایک اور مسز فلپ رہتی تھیں۔ جن کے شوہر کا اسی روز انتقال ہوا تھا۔ ڈاکیہ غلطی سے پادری کا تار مسز فلپ کو دے گیا۔ تار کا مضمون پڑھ کر دوسری

مسز فلپ حیران و پریشان رہ گئیں کیونکہ اس میں لکھا تھا۔

"خیریت سے پہنچ گیا ہوں بس گرمی جھلسائے دے رہی ہے۔"

مرسلہ ...... صوفیہ سلطان، کراچی۔

اردو کی کلاس ہو رہی تھی ماسٹر صاحب اردو قواعد سمجھا رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے ایک لڑکے کو کھڑا ہونے کا حکم دیا اور کہا۔

"میں چند جملے بولتا ہوں تم بتاؤ ان میں کون سا زمانہ استعمال ہو رہا ہے؟"

"میں نہانے جاتا ہوں، تم نہانے جاتے ہو، وہ نہانے جاتا ہے، ہم نہانے جاتے ہیں۔ بھلا کونسا زمانہ ہے یہ؟"

لڑکا خوشی سے بولا۔ "سر! عید کا۔"

مرسلہ ...... آغا وسیم حیدر، کراچی۔

غیر ملکی سیاح نے اپنے گائیڈ سے پوچھا۔

"پاکستان میں کالج یا یونیورسٹی کی کیا پہچان ہے؟"

گائیڈ نے جواب دیا۔ "جس عمارت پر ہر سیاسی پارٹی اور اس کے سربراہ کا نام لکھا ہو وہی کالج یا یونیورسٹی ہوتی ہے۔"

ایک سرکاری ملازم ناشتہ کرنے کے لئے میز پر بیٹھا تو گھنٹہ بھر تک اخبار ہی پڑھتا رہا پھر اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر اس نے آواز دی۔

"چائے لاؤ۔"

"چائے تو میں لے آتی ہوں۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

"مگر آج آپ کو وقت کا خیال ہی نہیں ہے کیا دفتر نہیں جائیں گے؟"

"دفتر!" وہ چونک کر بولا۔ "یا اللہ! میں تو اپنے دفتر میں چائے منگوا رہا تھا۔ یہ گھر کیسے پہنچ گیا؟"

مرسلہ ...... حاجی مظہر حسین لاشاری، بہاول نگر

ایک صاحب کا دعویٰ تھا کہ وہ شکاری رہ چکے ہیں اور بطور ثبوت وہ الم غلم شکاری قصے بیان کرتے رہتے لیکن ہمیشہ ادھورے، کبھی انہوں نے پورا قصہ سنایا ہی نہیں تھا۔

ایک دن کسی نے ان سے پوچھا۔ "صاحب کیا وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ ادھورے قصے ہی سناتے ہیں؟"

شکاری صاحب کچھ موج میں تھے۔ روانی سے بولے۔ "بھیا، کیا کریں کم بخت کباڑی پورے صفحوں والی کتاب ہی نہیں دیتا!"

مرسلہ ..... سائرہ کنول ثنا، کوئٹہ

کوثر۔ "تم ابھی تک زندہ ہو؟"

پروین۔ (گھبرا کر) کیوں کیا ہوا؟"

کوثر۔ "کل تمہاری امی میری امی سے کہہ رہی تھیں کہ بہن ذرا قینچی تو دینا پروین کا گلا کاٹنا ہے۔"

مرسلہ: جنید اختر، کراچی

اسپتال میں نمونیہ کا مریض اسی روز صحت یاب ہوا تھا۔ اس نے نرس سے کھانا مانگا لیکن ڈاکٹر نے اسے کھانا دینے سے منع کر دیا تھا۔ جب اس نے بہت ضد کی تو نرس نے چائے کے چمچے میں ابلے ہوئے چاول لا کر دے دیئے۔ مریض نے چاول کھا کر نرس کا شکریہ ادا کیا اور پھر بولا۔

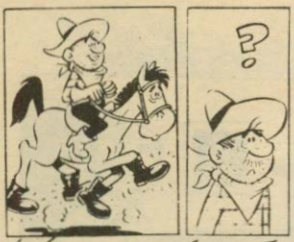

"اب میں کچھ مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاک کا کوئی ٹکٹ ہو تو لے آؤ۔"

مرسلہ ..... گل فیاض تنولی، ہزارہ۔

ایک دفعہ ایک جہاز میں کئی پاگل سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے فٹ بال کھیلنا شروع کر دیا۔ جہاز کے پائلٹ نے اسٹیورڈ سے کہا۔ "انہیں منع کریں۔"

اسٹیورڈ نے پاگلوں کو کہا۔ "آپ لوگ فٹ بال نہ کھیلیں جہاز بے قابو ہو رہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جہاز ہلنا بند ہو گیا۔ پائلٹ نے اسٹیورڈ سے ان کا شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ اسٹیورڈ جب آیا تو صرف جہاز میں ایک پاگل بیٹھا ہوا تھا۔ اسٹیورڈ نے پوچھا۔ "باقی لوگ کدھر ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں کہا کہ باہر جا کر فٹ بال کھیلو وہ کھڑکی سے نکل کر باہر کھیلنے گئے ہیں۔"

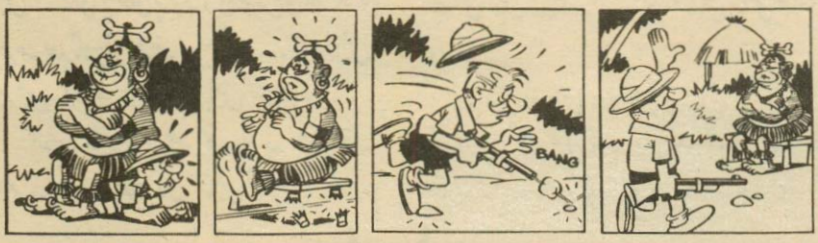

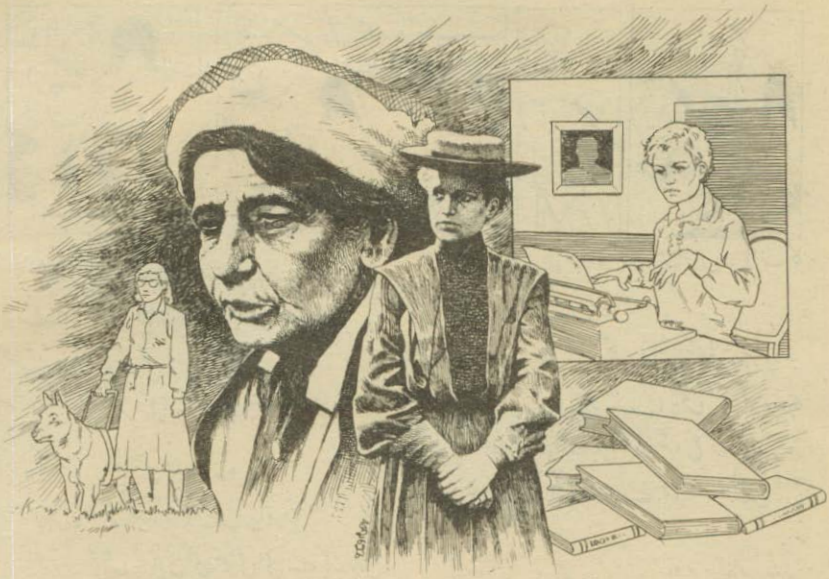

سب سے خاص بچی

غلام حسین میمن

وہ اتنی بہت سی لڑکیوں میں آکر بے حد خوش ہوئی۔ کیونکہ وہ سب ہی اس کی طرح اُنگلیوں سے ہجے کر کے باتیں کرنا جانتی تھیں۔ اس نے اسکول میں آتے ہی پڑھائی پر توجہ دینی شروع کی اور کچھ ہی عرصہ بعد تاریخ، جغرافیہ اور حساب کے علاوہ لاطینی، جرمن، فرانسیسی اور یونانی زبانیں سیکھ لیں۔

اسے کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ ابھرے ہوئے الفاظ والی کتابیں اکثر اس کے زیرِ مطالعہ رہتیں وہ اکثر کہا کرتی تھی: "کتابوں سے مجھے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو کچھ میں نہیں دیکھ سکتی وہ کتابیں بتاتی ہیں اور بار بار بتانے سے بھی نہیں تھکتیں۔ یہ ہر وقت کی ساتھی اور دوست ہیں۔"

چند سال بعد اس نے کالج کی زندگی میں قدم رکھا اور اپنی تعلیم مکمل کی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک خاص بچی قوتِ سماعت، بصارت

اور گویائی سے محروم ہوتے ہوئے تعلیمی میدان میں اتنی ترقی کرے گی اور اپنے جیسے کئی خاص بچوں کے لئے نمونہ بنے گی۔

یہ ہیلن کیلر تھی!

وہ مکمل صحت مند پیدا ہوئی تھی اور سارے گھر والوں کی آنکھ کا تارا تھی۔ ننھی سی عمر میں اس کے منہ سے ادا ہونے والے مما اور پپا کے الفاظ بڑے مسحور کن تھے۔ ابھی وہ ڈیڑھ سال کی ہی تھی کہ اسے بخار نے آلیا۔ بیماری کے دوران وہ کافی کمزور ہو گئی مگر پھر ایک دن اچانک بخار چلا گیا۔ بخار کے جاتے ہی تمام گھر والوں نے خوشیاں منائیں مگر یہ سب عارضی تھا کیونکہ بخار نے جاتے جاتے اپنا وہ اثر چھوڑا تھا جو بعد میں قوت بصارت (دیکھنے) اور قوت سماعت (سننے) سے محرومی کا سبب بنا۔ چونکہ وہ سُن نہیں سکتی تھی اس لئے بولنا بھی نہ سیکھ سکی اور یوں قوت گویائی سے بھی محروم رہی۔

چونکہ اب گھر والے اس پر توجہ نہیں کرتے تھے اس لئے وہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگی۔ ذرا ذرا سی بات پر چھوٹی بہن اور نوکروں کی پٹائی کر دیتی تھی مگر پھر اس کی زندگی میں ایک ایسی شخصیت داخل ہوئی جس نے اس کے طور اطوار اور سوچ کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔ یہ اس کی ٹیوٹر مس سلیوان تھیں۔ انہوں نے تعلیم اور تربیت دونوں پر توجہ دی اور ہیلن جس شے کو چھوتی وہ اسے اس کا نام ہتھیلی پر انگلی سے لکھ کر بتاتیں اور اس طرح اس نے چند مہینوں میں سو سے زائد نام یاد کر لئے۔

ایک بار جب وہ نیاگرا آبشار دیکھنے گئی تو آبشار کے گرنے کے مقام کے بالکل سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ بلندی سے گرتے ہوئے پانی کی گھن گرج اسے اپنے قدموں سے محسوس ہوتی تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ وہ نہ تو دیکھ سکتی ہے اور نہ سن پاتی ہے تو اس کے ذہن میں ان نظاروں کا کیا تصوّر ہے؟ ہیلن نے جواب دیا:

"میرے ذہن میں ان سب قدرتی نظاروں کا وہی تصوّر ہے جو محبت، خدا اور نیکی کا ہے ان سب کو بھی تو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔"

اسکول کی تعلیم اس نے اپنے جیسے بچوں کے درمیان مکمل کی اور اسی دوران ہی اس نے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس وقت خاص بچوں کے لئے علیحدہ کالج نہ تھا اس لئے اسے مکمل صحت مند بچوں کے ساتھ ہی کالج میں داخلہ لینا پڑا۔ دوران لیکچر اس کی ٹیوٹر اسے ہر بات ہتھیلی پر انگلی سے لکھ کر سمجھاتی جب کہ دوسرے ساتھی نوٹ بک میں لکھتے جاتے۔ یوں ہیلن آدھا لیکچر ہی سمجھ پاتی۔ اس کے لئے خاص طور پر ابھرے ہوئے الفاظ والی کتابیں تیار کروانے میں بھی خاص وقت لگ جاتا تھا۔ ان سب ساتھیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اسے اپنی جسمانی کمزوری کا بہت شدت سے احساس ہوتا تھا اور کبھی کبھی ناامیدی کا دورہ پڑ جاتا مگر پھر اس کی ٹیوٹر اسے حوصلہ دیتی اور وہ ہمت کر کے دوبارہ مشکلات کے مقابلے پر ڈٹ جاتی۔

ہیلن کی ساری جدوجہد میں اس کی ٹیوٹر سلیوان

کا بہت دخل ہے جس نے اسے ہر موقع پر تعلیم اور حوصلے سے نوازا مگر اس کے ساتھ ساتھ ہیلن کی خود اعتمادی اور علم کی لگن کا بھی دخل تھا۔ اگر وہ علم کی پیاسی نہ ہوتی تو کوئی بھی اسے اس مقام تک نہ لا سکتا تھا جہاں وہ آخری عمر میں تھی۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے خود کو اپنے جیسے معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دیا۔ اس نے نہ صرف اپنے آپ کو معاشرے میں ایک کامیاب فرد بنایا۔ بلکہ سماجی خدمات میں بھی حصہ لیا۔ اس نے خاص بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت پر مضامین اور کتابیں لکھیں۔ دور دور کے ملکوں میں جاکر لیکچرز دیئے اور معذوروں کو تعلیم حاصل کرنے پر اکسایا۔ اس سلسلے میں امریکہ کے علاوہ ایشیا کے کئی ممالک کے دورے کئے۔

۱۹۵۷ء میں وہ لاہور آئی اور گونگے بہرے بچوں کے اسکول میں تقریر کی اِس نے پُر زور طریقے سے حکومت اور عوام سے اپیل کی کہ وہ ان معذور بچوں کو بحال کرنے اور انہیں معاشرے میں فائدہ مند شہری بنانے کے لئے پوری توجہ دیں۔ اس نے اپنی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے کس طرح کوشش کر کے اپنی جسمانی کمزوری پر فتح پائی اور پی ایچ ڈی تک اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

تعلیمی سفر کے دوران اس نے چار اصول بنائے تھے اور آخر وقت تک ان پر کار بند رہی۔

(۱) ہر بات کو خوب سوچ سمجھ کر کرنا اور جلد بازی سے پرہیز کرنا۔

(۲) ہر شخص سے مخلصانہ محبت کرنا۔

(۳) ہر کام میں بلند مقصد کو پیش نظر رکھنا۔

(۴) اللہ پر مکمل ایمان اور یقین رکھنا۔

ان ہی اصولوں پر کار بند رہ کر وہ خاص بچی آج ہیلن کیلر کے نام سے تاریخ میں امر ہو گئی ہے۔

ایک حکایت

شیخ سعدی فرماتے ہیں میں ایک دفعہ بزرگوں کی ایک جماعت کے ساتھ کشتی میں سوار تھا۔ ہمارے پیچھے ایک چھوٹی کشتی ڈوب گئی اور دو بھائی بھنور میں پھنس گئے۔ بزرگوں میں سے ایک نے ملاح سے کہا "ان دونوں کو بچالے ہر ایک کے عوض تجھے ۵۰ دینار دونگا۔" ملاح پانی میں کود پڑا۔ اور ایک کو نکال لایا جبکہ دوسرا مر گیا۔ میں نے یہ دیکھ کر کہا "دوسرے کی عمر باقی نہ تھی۔ اسی وجہ سے تو نے اسے پکڑنے میں دیر لگائی اور وہ مر گیا۔" یہ سن کر ملاح بولا۔ "اس کی ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ میرا رجحان ایک کو پکڑنے کی طرف زیادہ تھا۔ کیونکہ ایک دفعہ میں جنگل میں پیدل جارہا تھا اور تھک گیا تھا تو اس نے مجھے اونٹ پر بٹھا لیا تھا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ سے میں نے بچپن میں کوڑا کھایا تھا۔" یہ سن کر میں نے کہا کہ خدا تعالیٰ سچ فرماتا ہے جو نیکی کرتا ہے وہ اپنے لئے کرتا ہے اور جو برائی کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے۔

مرسلہ...... نسیم احمد قائم خانی، پنو عاقل

شکست کا احساس ہی آغاز ہے شکست کا

ریحانہ منیر

راجر چارٹر اپنے زمانے کا اسٹار ایتھلیٹ تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک ٹرک نے کچل کر اسے دونوں ٹانگوں سے محروم کر دیا۔ دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر تک ضائع ہو گئی تھیں لیکن جوان ہمت راجر نے اپنی اس معذوری کو مجبوری نہ بننے دیا۔ بلکہ دس سال سے بھی زیادہ عرصے تک وہ لکڑی کی روایتی ٹانگیں لگائے زندگی کی مشکلات سے لڑتا رہا۔ پھر سائنسی ترقی اسکے لئے رحمت ثابت ہوئی اور وہ ایڈوانس میٹیریل سے بنی ہوئی ٹانگیں لگوانے میں کامیاب ہو گیا۔ انکی کارکردگی تقریباً ایسی ہی ہے جیسی انسان کی اصل ٹانگوں کی۔ اب راجر اوماہا ریلوے میں بحیثیت ڈسپیچر کے کام کرتا ہے۔ نارمل زندگی گذارتا

میرا رب دُعا کا بڑا سُننے والا ہے

سونے سے پہلے کی دُعا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰ

کھانے سے پہلے کی دعا

بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ

میں نے اللہ کے نام سے اور اللہ کی برکت پر کھانا شروع کیا۔

بیت الخلاء جاتے وقت کی دُعا

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں خبیث جنوں سے مرد ہوں یا عورت۔

جب سو کر اٹھے تو یہ دُعا پڑھے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ

اے اللہ! مجھے بہت توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں میں شامل کر دے۔

گھر سے نکلنے کی دُعا

بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

گھر میں داخل ہونے کی دُعا

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ الْمَوْلِجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا

اذان کے بعد کی دُعا

اَللّٰھُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِیْلَةَ وَالْفَضِیْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَعَدْتَّهٗ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ

کھانے کے بعد کی دُعا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا

بیت الخلاء کے بعد کی دُعا

غُفْرَانَكَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰى وَعَافَانِیْ

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھ سے ایذا پہنچانے والی چیز دور کی اور مجھے چین دیا۔

آئینہ دیکھنے کی دُعاء

اَللّٰھُمَّ كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِیْ فَحَسِّنْ خُلُقِیْ

سفر کی دُعا

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ

اللہ سے رابطہ دُعا کے ذریعے ممکن ہے یہ وہ پکار ہے جو اللہ تعالیٰ سُنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

منگوانے کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی

ادارے نے ایسی ہی مسنون دُعاؤں کو خوبصورت اور دیدہ زیب اسٹیکرز میں چھاپا ہے۔ ایک مکمل سیٹ کا ہدیہ ۲۵ روپے رکھا گیا ہے
آنکھ مچولی کے پتے پر ۲۵ روپے کا منی آرڈر بھیج کر آپ یہ دُعاؤں کا سیٹ

انعامی مقابلہ

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

		1	8	
	5	7		
4	6	13		
10	12			3
11			2	9

۱- دی گئی تصویر کے خالی خانوں میں ۱۴ سے ۲۵ تک کے ہندسے اس طرح لکھئے کہ دائیں سے بائیں، یا اوپر سے نیچے، کسی طرح بھی جمع کرنے پر اعداد کا مجموعہ ۶۵ کے برابر ہو؟

۲ - پچاس پچاس پیسے کے نو سکّوں کو دو سیدھی لائنوں میں اس طرح رکھیئے کہ ہر لائن میں پانچ سکّے ہوں۔

۳۔ ایک صاحب اپنے دوست سے ملنے جا رہے تھے ایک صبح وہ ایک T چوک پر پہنچے۔ دائیں اور بائیں جانے والی دونوں سڑکیں دو مختلف گاؤں کی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک گاؤں ایسے لوگوں کا تھا جو ہمیشہ جھوٹ بولتے تھے جب کہ دوسرے گاؤں کے لوگ کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ ان صاحب کے دوست سچے لوگوں کے گاؤں میں رہتے تھے لیکن اب انہیں یاد نہیں آرہا تھا کہ اس گاؤں کو جانے والی سڑک کون سی ہے۔ سیدھے ہاتھ والی یا الٹے ہاتھ والی۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ دونوں طرف سے ایک ایک آدمی چلا آرہا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کام کاج کے لئے اپنے گھروں سے باہر نکلے تھے۔ ان صاحب نے دونوں سے باری باری ایک ہی سوال کیا اور اس سے اندازہ لگا لیا کہ ان کا دوست کس گاؤں میں رہتا ہے۔ ذرا آپ بتایئے تو سہی کہ آخر انہوں نے دونوں سے پوچھا کیا تھا؟

۴۔ ایک بازار میں ایک صاحب کی پھلوں کی دکان تھی۔ ایک کلو گرام سے لے کر چالیس کلو گرام تک کا وزن تولنے کے لئے ان کے پاس صرف چار باٹ تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ انہیں پھل تولتے وقت دونوں پلڑوں میں باٹ رکھنے پڑتے تھے۔ آپ بتایئے کہ وہ چار باٹ کتنے کتنے وزن کے تھے؟

گذشتہ ماہ کے سوالات کے درست جوابات

۱۔ 11

۲۔ سوال غلط تھا۔

۳۔

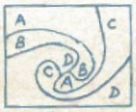

۴۔ ۳۰ منٹ بعد ۳۵ کلو میٹر کہ فاصلے پر۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب:۔

محمد فیصل ضیاء، بہاولپور۔

تمام سوالوں کا درست جواب دینے والے ساتھی:۔

مصحف رسول، کراچی۔ سید احسن علی، کراچی۔ وجاہت مغل، بھکر۔ فخر عباس تلہ، سرگودھا۔ محمد ممتاز تلہ، سرگودھا۔ عمر فاروق تلہ، سرگودھا۔ تیمور قریشی، کراچی۔ محمد فہیم ضیاء، بہاولپور۔ راحیل سلیم، گوجرانوالہ۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی:۔

محبوب الٰہی میمن، ٹنڈو آدم۔ پرنس انس ریاض ساگری، جہلم۔ محمد کامران کریم بخش شیخ، سکھر۔ ساجد کمالوی، کمالیہ۔ عبدالسلام شیخ، میرپور خاص۔ سیدہ مہ وش متین، کراچی۔ سید ثنا متین، کراچی۔ سید عاطف امین، کراچی۔ سید علی عمران زیدی، حیدر آباد۔ سید آزیبہ متین، کراچی۔ سید راحت حسین نقوی، کراچی۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ انشی حسنات، کمالیہ۔ ملک محمد فاروق، نواب شاہ۔ محمد حسن سروش، نواب شاہ۔ گلستان احمد، اسماعیل رابع، پشاور۔ امجد محمود، ملتان۔ خلیل اللہ، سوات۔ محمد یوسف راجپوت، بہاولپور۔ سمیر فاروق، ملتان۔ اظفر تنویر، ملتان، احمر فرقان، ملتان۔ نعمان احمد، کراچی۔

ایک سے زیادہ غلطیاں کرنے والے ساتھی:۔

ہمایوں سعید، ملتان۔ فیصل مختار، ملتان۔ محمد یوسف عمران راجپوت، بہاولپور۔ ثروت عباس، راولپنڈی۔ سید علی فاروق جمیل دشت، صادق آباد۔ سلیمان، کراچی۔ جاوید اصغر، رحیم یار خان۔ طارق علی یوسفی، حیدر آباد۔ افشاں غوری، حیدر آباد۔ صباحت حبیب خان، کراچی۔ سیدہ صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ علی زر خان سوز، سوات۔ لیاقت علی پروانہ، کراچی۔ کیڈٹ نعیم اکبر، کراچی۔ محمد کامران ایوب، کراچی۔ فرخ رشید خان، لاہور۔ فرید ساجد مغل، بھکر۔ اقبال حسن زئی، کراچی۔ عبدالقدیر انڈہڑ، پنو عاقل۔ ایاز عزیز علی، کراچی۔ وسیم احمد خان، کراچی۔ مظفر جاوید، کراچی۔ رحمت اللہ بشیر گجرات۔ ماریہ روپ چند، حیدر آباد۔ ارم فاطمہ، سکھر۔ علی اسلام، لاہور۔ مسعود احمد سومرو، گدو۔ ہرجیت سنگھ، مردان۔ شہزاد احمد تانی، کوئٹہ۔ غلام محی الدین، ڈسکہ۔ سمن زہرہ، کراچی۔ پروین رضا، لاہور۔ راشد اشرف اعوان، حیدر آباد۔ طاہر اشرف اعوان، حیدر آباد۔ حبیب اللہ، انیلا عنایت۔ طاہرہ عنایت، فادیا عنایت، پشاور۔ محمد بخش راہی (؟) علی اصغر کھوسہ، جیکب آباد۔ مولا بخش بلوچ، ساجن گوٹھ۔

نابینا بچے

کی نصیحت

محمد نوید مرزا

مری آنکھیں نہیں ہیں
پھر بھی دل کی روشنی سے دیکھ لیتا ہوں
مرا احساس روشن ہے
میں آنکھوں والے لوگوں سے
فقط اتنا ہی کہتا ہوں
کہ یہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں
تم آنکھوں سے اچھا دیکھنا
محسوس کرنا
ورنہ آنکھیں بند کر لینا

قسط نمبر ۳

وہ کیا راز تھا؟

محمد عمر احمد خان

جواد چھوٹے بھائی کے ہاتھوں میں دستانے دیکھ کر ڈر گیا تھا جب کہ چھوٹا بھائی کالی مکڑی کو دیکھ کر لیکن...... اصل کہانی سٹی اسٹیشن سے شروع ہوئی جب جواد نے ٹرین میں قدم رکھا۔ ٹرین میں اس کے ہم سفر ایک ادھیڑ عمر صاحب تھے جو پورے سفر کے دوران آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے اور ہاتھوں میں دستانے پہنے رہے۔ وہ نہایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے لیکن پھر جواد نے ان کی آنکھیں دیکھ لیں جو نہایت پُراسرار تھیں۔ انہوں نے جواد کو اسلام آباد میں ٹھہرنے کے لئے "ہوٹل اسپا" کا کارڈ دیا جو "ہوٹل اسپائڈر" نکلا۔ جواد نے ہوٹل فون کیا تو صرف پانچ منٹ میں ایک عجیب و غریب گاڑی اسے لینے اسٹیشن پہنچ گئی۔

اسلام آباد میں سخت سردی تھی۔ ہوٹل کی گاڑی اندر سے نہایت آرام دہ تھی اور اس کا ٹمپریچر سردی کو شکست دے رہا تھا۔ گاڑی کے چلتے ہی کئی سوالات جواد کے ذہن میں اُبھرنے لگے۔ ہوٹل توقعات سے زیادہ شاندار نکلا لیکن مرکزی گیٹ پر کالے رنگ کی بدہیت مکڑی کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے کمرے کی چابی جواد کی طرف بڑھائی تو نیچے گر گئی۔ ملازم نے چابی اُٹھا کر جواد کو دی تو جواد چونک گیا۔ ملازم کے ہاتھ میں آٹھ انگلیاں تھیں......!!!

(اب آپ آگے پڑھیے)

"تمہارے دستانے کہاں ہیں ؟" منیجر نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"وہ ..... وہ ..... سر! ابھی ہاتھ دھوئے تھے ناں اس لئے اُتار دیئے۔"

"بے وقوف! پہنو جلدی سے!!" جواد نے محسوس کیا کہ منیجر کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا تھا۔

ملازم نے جلدی سے سفید دستانے پہن لئے اور جواد کا سفری بیگ اُٹھا لیا۔

"چلئے جناب! آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔"

جواد ملازم کے پیچھے چل پڑا۔ ملازم کی پیٹھ جواد کی طرف تھی اور وہ بڑے مؤدب انداز میں چل رہا تھا جب کہ جواد اُلجھے ہوئے انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ دو خوبصورت راہداریوں سے گزرے اور پھر آبنوسی سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر پہنچے اور پھر کمرہ نمبر آٹھ پر رُکے۔

"لائیے جناب! چابی ..... میں دروازہ کھول دوں۔" ملازم نے بڑے مؤدب لہجے میں کہا۔

"نہیں! میں خود کھول لوں گا۔" جواد نے کہا پھر آگے بڑھ کر اس نے چابی لاک میں گھمائی لیکن لاک نہیں کھلا۔ جواد نے دوسری تیسری پھر چوتھی کوشش بھی کر ڈالی لیکن ناکام رہا۔

"یہ اس طرح نہیں کھلے گا ..... لائیے! چابی مجھے دیجئے!!"

ملازم نے مُسکراتے ہوئے کہا اور پھر چابی کو لاک میں اتنی بار گھمایا کہ جواد چند لمحوں تک کے لئے پریشان ہی ہو گیا کہ شائد لاک نہ کھُلے لیکن ایسا نہ ہوا اور لاک کھُل گیا۔ "تشریف لے چلئے!"

ملازم نے ..... کہا اور جواد کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے سرسری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ نہایت شاندار کمرہ تھا۔ ملازم اسے کمرے کے متعلق بتا رہا تھا اور جواد حیرت زدہ انداز میں سوچ رہا تھا۔ "اتنا شاندار کمرہ!!!" اور پھر اس سے پہلے کہ وہ ملازم سے پوچھتا کہ اس کمرے میں ٹھہرنے کے کیا اسے صرف "سو" روپے ہی ادا کرنے پڑیں گے؟ ملازم یہ کہہ کر "آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجا دیجئے گا" کمرے سے چلتا بنا۔

ملازم کے جانے کے بعد جواد نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا تو اس کی آنکھوں کی پتلیاں حیرت سے پھیلتی گئیں۔ کمرے میں آٹھ کا ہندسہ گردش کر رہا تھا۔ کھڑکی میں لگے شیشے آٹھ، دروازے میں بنے خانے آٹھ، دیواروں پر لگی پینٹنگز کی تعداد آٹھ اور جب وہ کمرے میں پڑی کرسی پر بیٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کرسی کی ٹانگیں بھی آٹھ حتیٰ کہ سامنے پڑی میز کے پائے بھی آٹھ تھے۔ جواد نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا تو چھت میں لگے جانوروں کی صورت والے بلبوں کی تعداد بھی آٹھ نظر آئی۔ کمرے کے ایک کونے میں خوبصورت سا شیشے کا جار تھا جس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ان کے تیرنے کا منظر نہایت دلفریب تھا۔ جواد بے اختیار جار کے قریب

کھنچتا چلا گیا اور پھر اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ رنگ برنگی مچھلیاں جو شیشے کے جار میں تیر رہی تھیں، ان کی تعداد بھی آٹھ تھیں۔

"یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟" جواد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوٹل کے پُراسرار..... ماحول نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔

جواد سر پکڑے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر ملازم کے ہاتھ کا عکس اُبھر رہا تھا جس میں آٹھ انگلیاں تھیں۔ "یقیناً اس کے پاؤں میں بھی آٹھ انگلیاں ہوں گی۔ جواد نے سوچا اور.....

اور ہوٹل کے تمام لوگوں کی بھی آٹھ انگلیاں ہوں گی جو انہوں نے دستانوں میں چھپائی ہوئی ہیں اور ان کی آنکھیں بھی یقیناً شیر بہادر صاحب کی آنکھوں کی طرح ہوں گی جن پر پردہ رکھنے کے لئے ان سب نے کالے چشمے لگائے ہوئے ہیں۔"

جواد کو بے اختیار شیر بہادر صاحب کی آنکھیں یاد آگئیں جب انہوں نے اسٹیشن پر چشمہ اُتارا تھا۔ "اُف! یقیناً وہ انسانی آنکھ نہیں تھی۔ وہ اُلّو کی آنکھیں تھیں گول اور پُراسرار۔"

سوچ سوچ کر جواد کے سر میں درد ہونے لگا۔ اسے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے..... کوئی پُراسرار ہالہ اسے ڈھانپنے کے لئے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ "نہ جانے یہ کون لوگ ہیں اور اتنے پُراسرار کیوں ہیں؟ شیر بہادر صاحب کا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ کیا مجھے اپنی جان کو خطرہ محسوس ہو رہا ہے؟؟ کیا یہ لوگ نقصان پہنچا سکتے ہیں؟؟؟ کئی سوالات یکے بعد دیگرے بڑی تیزی سے جواد کے ذہن میں اُبھرنے لگے۔ "مجھے یہ ہوٹل ہر حال میں چھوڑنا ہوگا۔" جواد نے فیصلہ کر لیا۔

اس نے سفری بیگ کاندھے پر ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے کو لاک کرنے لگا تو کمرہ بند نہ ہوا تب اس کی آنکھیں جیسے کچھ سوچ کر چمکنے لگیں۔ اس نے لاک میں دائیں طرف آٹھ بار چابی گھمائی تو دروازہ لاک ہو گیا تب جواد سیڑھیاں اُترتا ہوا راہداری عبور کرنے کے بعد منیجر کے قریب پہنچ گیا۔

"خیریت جناب؟" بڑے شائستہ لہجے میں منیجر نے پوچھا۔

"ہاں! میرا پروگرام تبدیل ہو گیا ہے۔ آپ آج کا کرایہ کاٹ لیجئے ..... میں اپنے عزیز کے گھر ٹھہروں گا جو راولپنڈی میں رہتے ہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی!" منیجر کے لہجے میں انکساری تھی۔ اس نے جواد سے کمرے کی چابی واپس لے لی پھر اچانک کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن جواد صاحب! ابھی آپ باہر نہیں جا سکیں گے.....!!"

"وہ کیوں؟" جواد نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اصل میں باہر طوفان آیا ہوا ہے اور سخت موسلا دھار بارش ہو رہی ہے پھر باہر ٹھنڈک بھی

بہت ہے کہیں آپ اس سخت موسلا دھار بارش میں بھیگ کر بیمار نہ پڑ جائیں۔" منیجر نے جلدی جلدی نہ صرف بتایا بلکہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر راہداری کے بائیں طرف بڑی کھڑکی کی طرف گیا۔

"ادھر آیئے!" اس نے کھڑکی کا پردہ سرکاتے ہوئے جواد سے کہا۔

"دیکھئے! باہر کتنی طوفانی بارش ہو رہی ہے۔" اور جواد نے بند کھڑکی کے شفاف شیشے سے باہر دیکھا تو واقعی بڑی تیز برسات ہو رہی تھی۔ باہر لگے درخت مست ہاتھیوں کی طرح وحشیانہ انداز میں چنگھاڑ رہے تھے۔ منیجر نے کھڑکی کا بڑا شیشہ تھوڑا سا کھولا ہی تھا کہ تیز بوندوں کی بوچھاڑ اور برف کی طرح سرد..... جھونکے ان سے آٹکرائے۔ منیجر نے جلدی سے شیشہ بند کر دیا۔

سردی سے جواد کے دانت بجنے لگے تھے۔

"آپ اپنے کمرے میں جایئے! میں آپ کے لئے گرم گرم قہوہ بھجواتا ہوں۔ جیسے ہی بارش کی شدّت میں کمی آئے گی آپ جاسکیں گے۔" منیجر نے بڑی انکساری سے کہا اور چابی واپس جواد کے ہاتھوں میں تھما دی۔

جواد اپنے کمرے میں چلا آیا۔ باہر سخت سردی تھی لیکن کمرہ خاصا گرم تھا۔ جواد کچھ دیر کمرے میں بچھے قالین پر ٹہلتا رہا پھر کھڑکی کے پردے سرکا کر بند شیشوں سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ ہرے ہرے درخت تیز بارش کی وجہ سے دُھند اور کہر میں گھرے تیزی سے دائیں بائیں..... ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

جواد کچھ دیر تک کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا پھر اُکتا کر کرسی پر آبیٹھا۔ "میں اندر آسکتا ہوں جناب؟" دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ساتھ ہی آواز بھی آئی۔ "آجاؤ۔" جواد نے کہا اور سفید وردی میں ملبوس ہوٹل کا ملازم قہوے کے بڑے ہاتھ میں اٹھائے اندر چلا آیا۔

اس نے کیتلی سے گرم گرم قہوہ کپ میں انڈیلا اور کپ جواد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "صاحب! کسی اور چیز کی ضرورت؟" ملازم نے ادب سے پوچھا۔ "نہیں..... بہت شکریہ!" ملازم دروازہ بند کر کے چلا گیا تو جواد نے محسوس کیا کہ کپ سے جو گرم گرم بھاپ نکل رہی ہے اس میں بے پناہ خوشبو ہے۔ جواد نے قہوہ کا پہلا ہی گھونٹ بھرا... تو مزا آگیا۔ قہوہ لاجواب تھا۔ اتنا خوشبودار اور مزے کا قہوہ جواد نے پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔

بارش دوپہر تک مسلسل ہوتی رہی۔

جواد نے دو مرتبہ باہر جانے کی کوشش کی لیکن سرد موسم اور اتنی تیز موسلا دھار بارش دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ دونوں بار اسے واپس اپنے کمرے میں آنا پڑا۔

کوئی دو بجے کے قریب ملازم ایک بڑی سی ٹرے میں دوپہر کا کھانا لے آیا۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے جواد کو بھوک کا احساس دلایا اور جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ مختلف اقسام کے

دو تین کھانے تھے جو بے حد لذیز تھے۔ ان کھانوں کا ذائقہ بالکل ان کھانوں جیسا تھا جو ٹرین میں اس نے شیر بہادر صاحب کے ساتھ کھائے تھے۔ جواد نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد ملازم دوبارہ قہوہ لے آیا اور خوشبو دار قہوہ پینے کے بعد جواد پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

ملازم برتن اُٹھا کر لے گیا تو جواد نے بند کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔

کھانے کھانے اور قہوہ پینے کے بعد جواد کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ اسے سخت نیند آرہی تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی تو ہوٹل کا ملازم دوڑا دوڑا چلا آیا۔

"جی صاحب؟"

"دیکھو! ایسا ہے کہ میں کچھ دیر کے لئے سو رہا ہوں جیسے ہی بارش تھمے مجھے اُٹھا دینا۔"

"بہتر صاحب!"

"ملازم مؤدب ہوتا ہوا واپس چلا گیا تو جواد نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کمرے میں پڑے آرام دہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔

"زیادہ کھا لینے کی وجہ سے شائد مجھے اتنی نیند آرہی ہے۔" اس نے سوچا اور پھر آنکھیں بند ہوتے ہی نیند کی دیوی اس پر غالب آگئی۔

نہ جانے کتنی دیر وہ سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ "افوہ! میں اتنی دیر تک سوتا رہا۔" پھر اس نے اُٹھ کر کھڑکی کے پردے سرکائے اور بند شیشوں سے باہر جھانکا تو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

تب جواد نے شیشے کو کھولا تو سرد ہوا کے جھونکے کمرے میں گھس آئے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جواد پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ابھی وہ کھڑکی کا شیشہ بند ہی کرنا چاہتا تھا کہ باہر اندھیرے سے کوئی چیز اُڑتی ہوئی آئی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی زور سے جواد کے چہرے سے ٹکرائی۔

جواد کے منہ سے ایک زوردار چیخ بر آمد ہوئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر چاروں شانے چت گر گیا.........!!

جاری ہے..... اس کہانی کے مزید دلچسپ اور پُراسرار واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمایئے!!

نوٹ فرمالیجئے

جنوری ۱۹۹۴ء سے ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی کا فون نمبر تبدیل ہوگیا ہے۔ نیا نمبر ۴۹۴۲۸۵۷ ہے۔ ہم نے نیا نمبر اسی ماہ کے شمارے میں لکھ دیا تھا مگر اکثر ساتھیوں کے خطوط یا بالمشافہ ملاقات سے اندازہ ہوا کہ انہیں فون نمبر کی تبدیلی کی تاحال اطلاع نہیں ہوئی۔ براہ کرم اِس تبدیلی کو نوٹ فرمالیجئے ادارے سے رابطے کیلئے نئے نمبر پر کال کیجئے۔ (ادارہ)

ٹانگ ٹوٹ
جائے تو ٹانگ
بے کار ہو جاتی
ہے ۔ اگر
ہمت ٹوٹ
جائے تو زندگی
بے کار ہو جاتی
ہے

ادارہ

عکس ادھورے کیجیے پورے

اِس مقابلے میں ہم ہر ماہ کسی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والی، دُنیا کی دو معروف شخصیات کے ادھورے خاکے شائع کرتے ہیں۔ آپ کو ان شخصیات کو پہچاننا ہے اور ان کی وجہِ شہرت بتانا ہے۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے آئندہ ماہ ہم صحیح جوابات کے ساتھ ان لوگوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شائع کریں گے۔ بالکل صحیح جواب دینے والے ساتھی کو ایک سال کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی مفت ارسال کیا جائے گا، ایک سے زیادہ درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

- جوابات الگ کاغذ پر صاف صاف تحریر کیے جائیں۔
- ہر ماہ کی دس تاریخ تک ادارہ کو موصول ہو جائیں۔
- جوابات کے ساتھ بھیجنے والے کا مکمل پتا ضرور ہو۔

ان تین شرطوں میں سے کسی ایک بھی شرط کے پورا نہ ہونے پر جوابات کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے گا۔

پتا: انچارج انعامی مقابلہ "عکس ادھورے کیجیے پورے"
ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۰، بی آئی بی کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰

گزشتہ ماہ شرارت نمبر آپ نے پڑھا۔ اس میں خوب خوب شرارتیں تھیں۔ آپ کے خطوں سے اندازہ ہوا کہ آپ لوگوں کو ان شرارتوں سے بہت مزہ آیا۔ ایک شرارت ہم نے بھی کی تھی۔ "عکس ادھورے کیجئے پورے" میں ہمیشہ کی طرح ہم نے دو ادھورے خاکے چھاپے تھے اور ان شخصیات کے بارے میں پوچھا تھا۔ بہت سے ساتھیوں نے جواب دیئے۔ کچھ نے محنت کی تھی، کچھ نے یونہی "تکے" چلائے۔ کچھ نے بتایا کہ یہ وسیم حسن راجہ اور ماجد خان ہیں۔ کسی کے خیال میں جاوید برکی اور وسیم راجہ تھے۔ کسی نے جیولیس سالک اور شاہ محمود قریشی کہا۔

ایک ساتھی نے ڈاکٹر نوبیل اور لوئی پاسچر بتایا۔ ایک نے مارکونی اور لوئی پاسچر۔ کچھ ساتھیوں نے ان کا سراغ مسلم سائنس دانوں میں لگایا اور یہ سلسلہ بو علی سینا، جابر بن حیان وغیرہ سے جا ملایا۔

بعض ساتھی ان کے کھوج میں فلمی دنیا میں جا پہنچے اور انہیں ان خاکوں میں جیمز بانڈ، چک نورس، وحید مراد اور اسلم پرویز کی شبیہ نظر آئی۔ یہ سب پڑھ کر ہمیں بہت مزہ آیا..... کیونکہ جو خاکے ہم نے چھاپے تھے ہم خود ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے..... ہم نے تو بس دو فرضی خاکے چھاپ دیئے تھے۔

کہئے کیسی رہی ہماری شرارت۔ اب ان ساتھیوں کے نام جنہوں نے بہر حال محنت تو کی۔

طیبہ عرفان، اسلام آباد۔ خرم مشتاق، گجرات۔ محمد علی جواد، لاہور۔ سعدیہ خان نیازی، ساہیوال۔ محمد فاروق منیر، لاہور۔ پروین رضا، لاہور۔ شعیب محمد خان، حیدر آباد۔ عدیل محمد خان، حیدر آباد۔ سید خرم حسن کاظمی، کراچی۔ سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔ سید حبیب علی، لاہور۔ محمد ناظم خان، کراچی۔ عمر بشیر کراچی۔ آصف نصر اللہ۔ غ۔ حسین، کراچی۔ عشرت اقبال، کراچی۔ عدنان عادل شیخ، حیدر آباد۔ سمیع اللہ، کوہاٹ۔ پرنس افضل شاہین، بہاولنگر۔ محمد امتیاز، راولپنڈی۔ نازیہ اعظم، گوجرانوالہ۔ عبدالقدیر اندھر، پنو عاقل۔ ضیا الرحمٰن، کراچی۔ سیف الرحمٰن، کراچی۔ فاطمہ عقیل، کراچی۔ صباحت حبیب خلاء، کراچی۔ نوید اختر، جنید اختر، زین اختر، نازش اختر، دانش اختر، کراچی۔ شمائلہ شکیل، وقاص بن شکیل، حمیرا ناز، حارث شکیل، شاہب شکیل، فلذا عروج، کراچی۔ ندیم شاہد، وسیم شاہد، ثمینہ احمد، سمیہ احمد، بشریٰ احمد، تنعیم شاہد، روبینہ ناز، مخدوم پور پہوڑاں۔ عابدہ، ساجد، اقبال، افضال، خانیوال۔ ایم تسلیم کنول، شمیم احمد، دلشاد احمد، کراچی۔ یاسمین ناز، عنبرین خان، نوشاد احمد خان، نوشین خان، شمشاد خان، بہاولپور۔ محمد یاسر، محمد حارث، تہمینہ، محمد اسد، کراچی۔ ندیم اشفاق، نعیم اشفاق، نورین اشفاق، راحیل اشفاق، فہیم اشفاق، خانیوال۔ فوزیہ، شگفتہ، غزالہ، سعدیہ، کراچی۔ عروج، صدف، نوشہرہ۔ گل احمد خان، ایبٹ آباد۔ ارشاد محمود، ارشد ندیم، آزاد کشمیر، عبدالرشید، کنری۔ سراج الدین، راشد احمد، بھکر۔

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۶۰ روپے بنتی ہے

مگر

ممبرشپ حاصل کرنے پر ۶۰ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۲۰۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔
- مشرقِ وسطیٰ کیلئے ۴۰۰ روپے
- امریکہ اور یورپ کیلئے ۵۰۰ روپے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہ نامہ آنکھ مچولی - 1 - پی - آئی - بی کالونی، کراچی - ۵

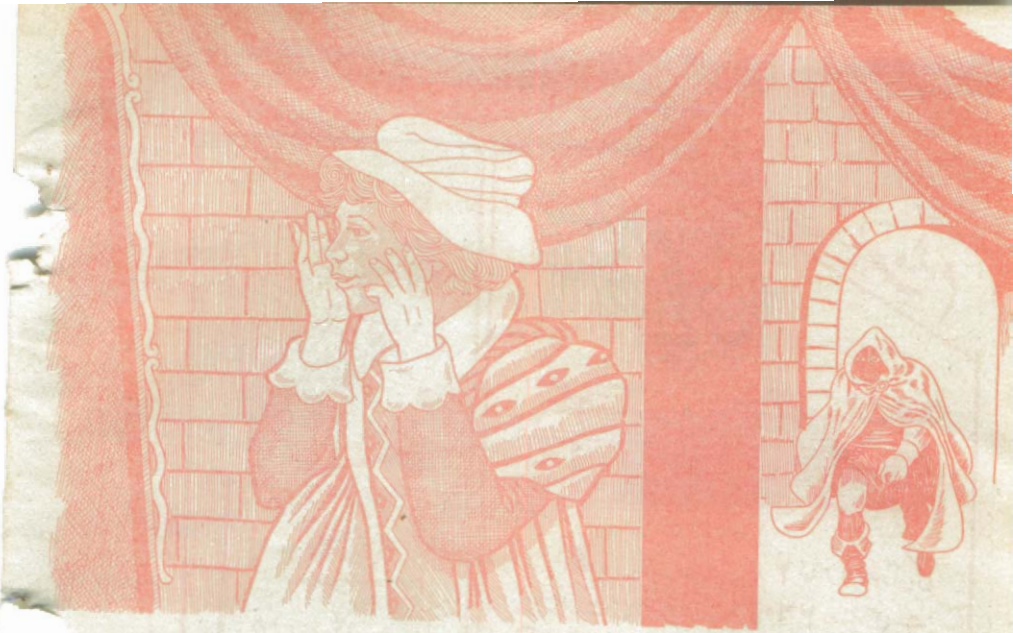

ایک تاریخی کہانی

قیمتی لباس

سید نظر زیدی

بہت پرانے زمانے کی بات ہے، ترکی کے ایک دینی مدرسے کے دو طالب علم مدرسے کے ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک طالب علم بہت اداس لگ رہا تھا۔ اس کا ساتھی اسے اپنے دادا ابا کی بہادری کا ایک بہت دلچسپ واقعہ سنا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ واقعہ سن کر اس کا دوست خوش ہو گا، اور خود بھی کوئی ایسا ہی واقعہ سنائے گا، لیکن اسے اداس دیکھا تو بات ادھوری چھوڑ کر بولا۔

"اتابک، لگتا ہے میرے دادا ابا کی بہادری کا شاندار واقعہ سن کر تم خوش ہونے کے بجائے اداس ہو گئے ہو۔ آخر کیوں؟"

"کوئی خاص بات تو نہیں، بس یونہی مجھے خیال آ گیا تھا کہ اللہ پاک نے میرے ماں باپ کو تمہارے ماں باپ کی طرح امیر کیوں نہیں بنایا، تمہارے دادا ابا فوج کے بہت بڑے افسر تھے نا؟" اتابک نے جواب دیا۔

"ہاں وہ بہت بڑے افسر تھے۔ انہوں نے کئی جنگوں میں بہت بہادری دکھائی تھی اور سلطان نے خوش ہو کر انہیں ایک بڑی جاگیر دی تھی۔ اب

میرے ابا جان اس جاگیر کے مالک ہیں۔"

دوسرے طالب علم نے کہا۔ "لیکن میرے دوست، یہ تو دنیا کی ایک عام بات ہے۔ اللہ پاک کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں انہیں ان کی محنت اور قابلیت کا انعام ملتا ہے، جیسے میرے دادا ابا کو انعام ملا تھا۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ محروم رہتے ہیں۔ لگتا ہے تمہارے دادا صاحب نے کوئی بڑا کام نہیں کیا تھا۔ بس اس لئے تم غریب ہو۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جو لوگ چالاک اور بے ایمان ہوتے ہیں وہ دوسروں کا حق چھین کر امیر بن جاتے ہیں۔" اتابک نے بہت غصے سے کہا۔

"مانتا ہوں ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن چالاک اور بے ایمان لوگوں کی کامیابی سچی کامیابی نہیں ہوتی۔ ایک دن آتا ہے جب ان کی بے ایمانیاں ظاہر ہو جاتی ہیں اور انہیں سزا دی جاتی ہے۔ سچی خوشی، عزت اور کامیابی انہی کو ملتی ہے جو نیک بہادر اور قابل ہوتے ہیں اور خدا کے فضل سے میرے دادا جان ایسے ہی تھے۔"

دوسرے طالب علم نے کہا جس کا نام مصطفےٰ آفندی تھا۔

اتابک بولا۔ "چلو جی یونہی سہی۔ بحث کرنے کا کیا فائدہ۔ اگر تمہاری بات سچ ہے تو میں نیک اور بہادر بننے کی کوشش کروں گا۔"

"اور تم نے ایسی کوشش کی تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں تم بہت شاندار کامیابیاں حاصل کرو گے۔ ویسے یہ تو بتاؤ تمہارا دل کیا بننے کو چاہتا ہے؟ میں تو اپنے دادا جان کی طرح فوجی افسر بنوں گا۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو؟" مصطفےٰ آفندی نے بات ختم کر کے اتابک کی طرف دیکھا۔

"نہیں بھئی میرے دل میں یہ ارمان بالکل نہیں ہے کہ فوجی افسر بنوں، میں تو شہزادہ بننا چاہتا ہوں جو فوجی افسروں پر حکم چلا سکتا ہو۔" اتابک نے جواب دیا۔ "مجھے شہزادوں کا قیمتی لباس بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اور میرے نزدیک یہ تمہاری نادانی ہے۔ اس بات میں تو ذرا شک نہیں کہ اللہ پاک سب کچھ کر سکتا ہے اس نے کتنے ہی ایسے لوگوں کو تاج اور تخت کا مالک بنا دیا جو بالکل غریب تھے، لیکن عقلمندی، یہ ہے کہ انسان اس چیز کی تمنا کرے جسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو، میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم ایسا عالم بننے کی کوشش کرو جس کی سب عزت کرتے ہیں۔" مصطفےٰ آفندی نے کہا۔

"محنت سے علم حاصل کرو گے تو ایسا عہدہ حاصل کرنا مشکل نہیں۔"

اتابک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اور میرا خیال ہے اب ہمیں یہ بات یہیں ختم کر دینی چاہئے۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ اپنے بندوں کی دعائیں بھی قبول کرتا ہے تو میں تو شہزادہ بننے کی دعا ہی مانگوں گا۔"

"تمہاری مرضی۔" مصطفےٰ آفندی نے رحم

بھری نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

جس وقت یہ طالب علم اپنے مدرسے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں کر رہے تھے، شاہی محل میں سلطان کی ایک بیگم اپنے محل کے داروغہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رنج سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو کیا میرے بیٹے کی جان بچنے کی کوئی صورت نہیں؟"

"ابھی ایسا ہی ہے۔ شہزادے صاحب کو قتل کر دینے کا حکم جاری کر دیا گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا جلاد کب یہاں آئیں اور انہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" داروغہ نے جواب دیا۔

بیگم چیخنے کے انداز میں بولی۔ "لیکن میرے لختِ جگر کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیوں ہو رہا ہے کیا وہ مرحوم سلطان کا بیٹا نہیں ہے؟"

داروغہ نے رنج بھرا سانس لے کر کہا۔ "حضور بیگم صاحبہ! یہی تو شہزادے صاحب کی بدقسمتی ہے کہ وہ مرحوم سلطان کے بیٹے ہیں۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں قاعدہ ہے کہ نیا سلطان اپنے ان بھائیوں کو قتل کرا دیتا ہے جو اس کی جگہ سلطان بننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔"

"لیکن میرے بیٹے نے تو ایسا دعویٰ نہیں کیا!" بیگم نے کہا۔

داروغہ بولا۔ "لیکن کسی وقت وہ یہ ارادہ کر تو سکتے ہیں چنانچہ اسی شک کی وجہ سے ان کے اور دوسرے شہزادوں کے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔"

"یا میرے اللہ!" بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "اے میرے خدا، کیا یہ میرے بیٹے کا قصور ہے کہ سلطان کے گھر پیدا ہوا؟ کاش وہ کسی کسان کے گھر پیدا ہوتا۔"

داروغہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحب صبر کیجئے..... ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، اگر آپ نے اسے پسند کیا تو امید ہے کہ شہزادے صاحب کی جان بچ جائے گی۔"

"وہ تدبیر کیا ہے؟ مہربانی کر کے جلدی سے بتاؤ ہمیں۔" بیگم صاحبہ نے امید بھری نظروں سے داروغہ کی طرف دیکھا۔

"وہ تدبیر یہ ہے بیگم صاحبہ، کہ شہزادہ صاحب کی عمر کے کسی نوجوان کو ان کا شاہی لباس پہنا کر ان کے خاص کمرے میں بٹھا دیا جائے اور ان سے کہا جائے وہ محل سے نکل کر کہیں چھپ جائیں، بلکہ بہتر تو یہ ہو گا کہ اس ملک ہی سے نکل جائیں۔ زندہ رہیں گے تو انشاء اللہ کبھی نہ کبھی پھر یہاں آنے کا موقع مل جائے گا۔"

"لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ جلادوں کو یہ معلوم نہ ہو جائے گا کہ یہ شہزادہ نہیں ہے؟" بیگم نے کہا۔ ویسے اب ان کی گھبراہٹ کم ہو گئی تھی۔

"جی بالکل ہو سکتا ہے۔ ابھی کافی وقت ہے میں سارا کام خود کروں گا۔ اس سلسلے میں اطمینان

کی بات یہ ہے کہ جن جلادوں کو شہزادے صاحب کے قتل کا کام سونپا گیا ہے وہ نئے ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہ ہو گا جس نوجوان کو وہ لے جا رہے ہیں وہ اصلی شہزادہ نہیں ہے۔" داروغہ نے بیگم صاحبہ کو یقین دلایا اور اس کی یہ بات سن کر وہ خوش ہو گئیں۔

بیگم صاحبہ کو اطمینان دلا کر داروغہ شاہی محل سے باہر آیا تو اتابک محل کے سامنے کھڑا حسرت بھری نظروں سے سنہری جالیوں والی کھڑکیوں اور بیل بوٹوں سے سجے ہوئے دروازوں کو دیکھ رہا تھا۔ داروغہ نے اسے دیکھا تو اس کو یوں لگا جیسے غیب سے اس کی مدد ہوئی ہے۔ اتابک قد کاٹھ میں بالکل شہزادے جیسا تھا۔ داروغہ جلدی سے اس کے پاس آ گیا اور پیار بھری آواز میں بولا۔ "کیا بات ہے بیٹے! یہاں کیوں کھڑے ہو اور کیا دیکھ رہے ہو؟"

"خدا کی شان دیکھ رہا ہوں جناب! ایک طرف یہ شان دار خوشنما محل ہیں اور دوسری طرف غریبوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں، سوچ رہا ہوں جو لوگ ان محلوں میں رہتے ہیں کتنے خوش قسمت ہیں کیسا آرام ملتا ہو گا انہیں!"

اتابک نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔

"داروغہ اس کے اور قریب آ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارا دل چاہتا ہے کہ اس شاندار محل میں رہو؟"

"میری ایسی قسمت کہاں ہے جناب! میں تو ایک غریب طالب علم ہوں۔ میرے لئے تو یہی بہت ہے کہ کبھی کبھی اس محل کو دیکھ لیتا ہوں۔"

اتابک نے رنج بھری آواز میں کہا۔

"کیوں تمہاری قسمت کو کیا ہوا ہے؟ ہمیں تو یوں لگ رہا ہے کہ تمہاری قسمت بدل گئی ہے اور تھوڑی دیر بعد ہی تم شہزادے بن جاؤ گے یقین نہیں آتا تو آؤ، ہماری مانو، ہم ابھی تمہیں شاہی لباس پہنا کر شہزادہ بنا دیں گے۔" یہ کہہ کر داروغہ نے بہت پیار سے اتابک کا ہاتھ پکڑا اور اسے محل کے اندر لے گیا۔

اتابک نے اپنی کتاب میں بغداد کے ابوالحسن کی کہانی پڑھی تھی جسے ایک رات کے لئے بادشاہ بنا دیا گیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ خدا اس پر مہربان ہو گیا ہے اور اسے بھی ابوالحسن کی طرح شاہی محل میں لے جایا جا رہا ہے۔ خوشی اور حیرت سے اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔

داروغہ اتابک کو سیدھا شہزادے کے کمرے میں لے گیا اور کنیزوں کو حکم دیا۔ "انہیں شاہی حمام میں لے جاؤ اور نہلا کر شہزادے صاحب کا سب سے اچھا لباس پہنا دو۔"

کنیزوں نے اس حکم پر فوراً عمل کیا۔ وہ اتابک کو سنگ مرمر سے بنے ہوئے حمام میں لے گئیں۔ خوشبو ملے گرم پانی سے خوب مل مل کر اسے نہلایا اور شہزادے کا بڑھیا جوڑا پہنا کر شہزادہ بنا دیا۔

اتابک نے بڑے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ جگ مگ کرتے لباس میں وہ

بہت ہی شاندار لگ رہا تھا۔ اپنے آپ کو ایسی اچھی حال میں دیکھ کر اسے یوں لگا شاید یہ خواب ہے اس نے زور سے اپنا ہاتھ کاٹا اور جب یقین ہو گیا کہ وہ سو نہیں رہا بلکہ جاگ رہا ہے تو خوشی سے اچھلنے لگا اور منہ بنا کر اونچی آواز میں بولا۔

"آفندی کے بچے، دیکھ میں سچ مچ شہزادہ بن گیا ہوں۔ تو کہا کرتا ہے ایسی باتیں کبھی نہیں سوچنی چاہئیں جو پوری نہ ہو سکیں۔ لیکن میں نے جو کچھ سوچا تھا پورا ہو گیا۔ میں شہزادہ بن گیا۔ معزز شہزادہ، اب میری ہر خواہش پوری ہوگی۔ ہر حکم مانا جائے گا، واہ بھئی واہ۔"

"کس سے باتیں ہو رہی ہیں شہزادے صاحب؟" داروغہ نے حمام کے اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا جس میں اتابک کھڑا تھا۔ داروغہ کے ساتھ ایک نوجوان تھا جس نے اتابک کا وہ لباس پہن رکھا تھا جو اس نے ذرا دیر پہلے اتارا تھا۔

"جی کسی سے نہیں بس یونہی اپنا ایک احمق دوست یاد آ گیا تھا جو کہا کرتا تھا انسان کو فضول باتیں نہیں سوچنی چاہئیں، اللہ جس حال میں رکھے خوش رہنا چاہئے۔ اگر وہ اس وقت یہاں آ جائے تو اس سے کہوں دیکھ آفندی کے بچے میں ایک غریب طالب علم سے شہزادہ بن گیا۔"

"بہت خوب، بہت خوب، اگر وہ بیوقوف کبھی مل جائے تو اسے یہ بات ضرور بتانا۔" داروغہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر شہزادے کی طرف دیکھ کر بولا۔ "محترم شہزادے! آپ کی زندگی میں جو انقلاب آیا ہے اس سے پریشان نہ ہوں ذاتی طور پر میں تو یہ خیال کر رہا ہوں کہ آپ کے پہلے لباس کے مقابلے میں طالب علم کا یہ معمولی لباس زیادہ مبارک ثابت ہوگا۔ اگر آپ نے اس لباس کی عزت کی تو پہلے سے زیادہ شان اور آرام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ جایئے اپنی ہمت اور قابلیت سے عزت کا مقام حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ جایئے میں نے آپ کو خدا کے حوالے کیا۔"

شہزادے کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی لیکن اس نے داروغہ کی یہ بات بہت غور سے سنی اور کچھ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

شہزادے کے جانے کے بعد داروغہ نے رحم بھری نظروں سے اتابک کی طرف دیکھا جو بہت ہی خوش نظر آ رہا تھا اور کنیزوں کو حکم دیا۔

"اس نئے شہزادے کو شہزادے صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا دو اور اگر کوئی ان کے بارے میں پوچھے تو ان کے پاس پہنچا دینا، چاہے وہ جلاد ہی کیوں نہ ہو۔"

"داروغہ کی یہ بات سن کر کنیزوں نے بھی رحم بھری نظروں سے اتابک کو دیکھا۔ وہ اصل بات سمجھ چکی تھیں۔ لیکن خود اتابک کو آنے والے حالات کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ بہت خوش ہو کر آستین میں ٹنکے ہوئے موتی گن رہا تھا۔○

سردی کی ہے بات

عباس عالم

چھوٹے سے اِک دن کے پیچھے لمبی سی اِک رات
دیکھا تم پہچان گئے نا! سردی کی ہے بات
کل جب موسم سرد بہت تھا اور ہوائیں خوب
ہم گھر سے نکلے تھے پینے گرم کوئی مشروب
گرم کوئی مشروب کہ جیسے کافی جیسے چائے
جس کو پینے سے باتوں میں گرمی سی آجائے
کافی چائے پی نہ پائے ہوٹل پایا بند
آخر گھر کی جانب پلٹے قدم اٹھائے چند
ہم کو تنہا پا کر سردی ہم سے آٹکرائی
ایک اِک کر کے اپنی ہر پہچان ہمیں بتلائی
بولی مجھ سے ملئے! مجھ کو سردی کہتے ہیں
میں جب باہر ہوتی ہوں نا! گھر میں رہتے ہیں
آپ بھی صاحب اپنے گھر کو فوراً فوراً جائیں
میں نے جو بتلایا ہے اب اوروں کو بتلائیں
جلدی جلدی چلتے چلتے ہم تو گھر کو آئے
پھر یہ سوچا سردی کا افسانہ لکھا جائے
اپنے کمرے میں آبیٹھے، اوڑھا ایک لحاف
سوچ کے اس کاغذ پر لکھی ایک نشانی صاف
چھوٹے سے اک دن کے پیچھے لمبی سی اک رات
دیکھا تم پہچان گئے نا! سردی کی ہے بات

بنامِ آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

رضوانہ کنول، کراچی۔ آنکھ مچولی کا شرارت نمبر بے حد پسند آیا۔ "بارش ابا جان اور میں"، "ایڈیسن کی شرارتیں"، "جن کا بچہ"، "جوئیوں ہوتا"، "کھل نہ جائے میرا پول"، "تمہیں پتہ ہے"، "پورب کی ہوا" اور "وہ کیا راز تھا" کی دوسری قسط بے حد پسند آئی۔ صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ شرارتی تحفہ اور شرارتی سرورق دونوں پسند آئے۔ کہانیوں میں "اے خدا مجھے معاف کر دے"، "بے چارے بھائی جان"، "یونیورسل شرارتی"، "میری پہلی اور آخرت شرارت" اور "شرارتوں کے شہر میں" مزیدار تحریریں تھیں۔ محمد سعید گلاب، کراچی۔ یہ بات تو ماننا ہی پڑے گی کہ منفرد ترین سرورق کے معاملے میں آنکھ مچولی کا کوئی حریف نہیں۔ علی احمد، ساہیوال۔ پہلی بار محفل میں

عزیز گرامی

سلام مسنون

پرچہ ملا صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میری تمام توقعات سے بلند ہے۔ شرارت نمبر پڑھ کر جی چاہا کہ اس بڑھاپے میں بھی کوئی شرارت کروں۔ اس سے زیادہ شرارت نمبر کیا اثر ڈال سکتا ہے!

آپ کو یہ یادگار نمبر شائع کرنے پر دلی مبارک باد ہو۔

آپ کا اپنا

میرزا ادیب

۳ فروری ۹۴

شرکت کر رہا ہوں اس لئے درخواست ہے کہ میرا خط بنام آنکھ مچولی میں ضرور شامل کیجئے گا۔ ساجد حبیب عزیز، کراچی۔ شرارتوں سے بھرا شرارت نمبر موصول ہوا پہلی بار اتنی ساری شرارتیں پڑھنے کو ملیں بہت مزہ آیا لیکن "گفٹ" خاص نہ تھا۔ پرنس عمر ریاض ساگری، دینہ۔ شرارت سے بھرپور، انوکھا شرارتی نمبر بے حد پسند آیا۔ تمام تحریریں لاجواب تھیں۔ شرارتی لکھاریوں نے نت نئی شرارتیں پیش کر کے خاص نمبر کو چار چاند لگا دیئے۔ عبداللہ شہزاد گل، پشاور۔ اتنا اچھا شرارت نمبر نکالنے پر میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ حنا احمد، راولپنڈی۔ شرارت نمبر اپنی مثال آپ تھا۔ "جاوید میانداد کی شرارتیں" اور "وہ کیا راز تھا" لاجواب تحریریں تھیں۔ جمیل بشیر سانجھری، حیدر آباد۔ "شریر لڑکوں کی قوالی" اور "موج میلہ" بہترین نظمیں تھیں۔ روح اللہ سعدی، کراچی۔ "شرارت نمبر" دیکھ کر امی پریشان ہو گئیں لیکن جب ہم نے انہیں بتایا کہ آنکھ مچولی نے ہمیں ایسی شرارتوں سے منع کیا ہے جس سے کسی کو نقصان پہنچے تو تب کہیں جا کر ان کی جان میں جان آئی۔ سعید احمد، کراچی۔ "بچاؤ" کی تیرہویں قسط بہت پسند آئی۔ محمد جاوید بھٹی، کوٹری۔ سلسلہ وار کہانی "بچاؤ" مجھے بہت پسند ہے اسے میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ عثمان عدیل، جہلم کینٹ۔ اس خاص نمبر میں شرارتیں عروج پر نظر آئیں۔ ملک طارق محمود اعوان، گولارچی۔ "سنہرے حروف"، "ایک خوش طبع صحابی"، "جنید شریر"، "میاں جی کی جوتی"، "شرارت کا بدلہ"، "ادیبوں کی شرارتیں"، "ببلو گبلو"، اور "شریر ہرن" جیسی تحریریں بے حد پسند آئیں۔ قرۃ العین جیلانی، (؟) شرارت نمبر کے لئے صرف اتنا کہنا ہے کہ دل کو چھو لینے والا تھا لیکن گدگدانے والا نہیں۔ محمد یوسف گل، کراچی۔ "جادوئی کتاب" کا تحفہ بے حد پسند آیا۔ سلمان احمد نواب، کراچی۔ سرورق لاجواب تھا۔ سو کی سو تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔ کس کس چیز کی تعریف کروں؟ "سرورق، کہانیاں، نظمیں، مضامین کارٹونز" سب ہی لاجواب تھے۔ محمد سلیم بخش، کراچی۔ فروری کا خاص نمبر لاجواب رہا۔ تحفہ بھی پسند آیا۔ "جن کا بچہ"، "شریر ہرن" اور "میری جو شامت آئی" مزے دار کہانیاں تھیں۔ صائمہ شاد، کراچی۔ شرارت نمبر میں اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ماجد لطیف، لاہور کینٹ۔ خاص نمبر اپنی تمام تر شرارتوں کے ساتھ جلوہ پذیر ہوا۔ "توبہ توبہ"، "شرارت مہنگی پڑی"، "بیگار کیمپ اور شرارت" لاجواب تحریریں تھیں لطائف البتہ پرانے اور بور تھے۔ "بلا عنوان" کہانی کا سلسلہ پسند آیا۔ سید راحت حسین نقوی، کراچی۔ شرارت نمبر کا سرورق خوب صورت تھا۔ کہانیوں میں "بیگار کیمپ اور شرارت" سے زیادہ دلچسپ تحریر کوئی اور تھی ہی نہیں۔ "اماں بی کی شرارت"، "اشرف کی شوخی"، "تمہیں پتہ ہے"، "شرارت ہی تو ہے"، "شرارت برائے روزگار" اور "چونے کی شرارت" بھی پسند آئیں۔ جا بجا شرارتی تصویروں نے رسالہ پڑھنے کا لطف دوبالا کیا۔ گلستان احمد، اسماعیل رابع، سرحد۔ شرارت نمبر قابل دید تھا۔ مریم خالد، اسلام آباد۔ آنکھ مچولی کا شرارت نمبر ملا تو خوشی ہوئی لیکن بنام آنکھ مچولی میں اپنا خط شامل نہ دیکھ کر بے حد غصہ آیا۔ لیاقت علی، انبالیاں۔ انکل! میرے گھر والے مجھے رسالے پڑھنے سے روکتے ہیں۔ میں چھپ چھپ کر آنکھ مچولی پڑھتا ہوں۔ آپ ہی میرا مسئلہ حل کریں! ○ ..... رسالہ گھر والوں کو پڑھنے کے لئے دیں اور ان سے پوچھیں کہ اس رسالے میں خرابی بتا دیں تاکہ آئندہ نہ پڑھوں۔ محمد آصف ندیم، چوک رجانہ۔ میں ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے قصبے میں رہائش پذیر ہوں اور ہر ماہ آنکھ مچولی خریدنے کے لئے اتنا فاصلہ طے کرتا ہوں لیکن آپ میری کوئی تحریر نہیں چھاپتے! ○ ..... لیجئے! اس بار آپ کا شعر شامل اشاعت ہے۔ سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔ "جاوید میانداد کی بچپن کی شرارتیں" بے حد دلچسپ لگیں۔

ایک خط ایک مسئلہ

جناب ایڈیٹر صاحب!

آپ کی توجہ ایک نہایت اہم اور انتہائی سنگین مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ مسئلہ ہے "بسنت" کا۔

"بسنت" ہندوؤں کا تہوار ہے جو ہم مناتے ہیں۔ ہر سال بسنت پر ہم نہ جانے کتنا پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ ملک کا لاکھوں روپیہ فضا میں اُڑا دیا جاتا ہے۔ لوہے کے تاروں سے پتنگیں اُڑانے سے بار بار بجلی میں تعطل پیدا ہوتا ہے۔ لاکھوں روپوں کی مشینری تباہ ہو جاتی ہے اور سینکڑوں بچے پتنگیں لوٹتے ہوئے سڑکوں پر گاڑیوں سے ٹکرا جاتے ہیں یا چھتوں سے گر کر ٹانگیں تڑواتے یا جانوں سے ہاتھ دھو لیتے ہیں۔

کیا حکومت "بسنت" کے اس نامعقول تہوار پر پابندی نہیں لگا سکتی؟

محمد عبدالرحمٰن، لاہور

راحت صلاح الدین، کراچی۔ "بجذمت جناب" کے کالم میں اس مرتبہ جو مسئلہ اٹھایا گیا ہے وہ بہت توجہ طلب ہے۔ شب برات پر تو پٹاخے پھوڑے جاتے ہیں۔ سال کے آغاز پر بھی پھلجڑیاں چھوڑی جاتی ہیں۔ نامعلوم ہماری قوم کس رستے کی طرف چل نکلی ہے؟

ویسے آپ نے یہ اچھا سلسلہ شروع کیا ہے کہ ہر ماہ کسی نہ کسی مسئلے کی نشاندہی کی جاتی ہے لیکن اچھا تو تب ہو گا جب آنکھ مچولی میں اٹھائے جانے والے مسئلوں کا سدباب کیا جائے! ○ ..... ان مسائل کے حل کے اصل ذمہ دار حکومت کے عہدہ داران ہیں۔

فوزیہ علوی، سندھ۔ انکل! ہماری ایک خواہش ہے کہ آپ اپنی تصویر آنکھ مچولی میں شائع کریں۔ پلیز! ○ ..... بھئی بچے کہیں ڈر نہ جائیں۔ **عمارہ گل آغا، کراچی۔** پہلی بار آنکھ مچولی کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ نومبر اور دسمبر کے شمارے مجھے بے حد اچھے لگے۔ **آفتاب احمد لولائی، لاڑکانہ۔** یہ میرا پہلا خط ہے ڈر رہا ہوں کہ آپ شائع بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ **فیصل عمران پپّی، گوجرانوالہ۔** آنکھ مچولی پڑھنے سے میری معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ **فیصل وقار علی، کراچی۔** آنکھ مچولی بھائی! آپ نے میرا خط نہ چھاپا تو میں ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جاؤں گا۔ ○ ..... کیا اب بھی.....!! **لالہ رخ، کراچی۔** بلا عنوان کہانی کا سلسلہ ایک اچھا قدم ہے۔ **محمد سجاد حسنین، لاہور۔** روپیٹ کر ایک ہی خط بھیجا تھا جو آپ نے شائع نہیں کیا.....!! ○ ..... بری بات۔ خط ہمیشہ ہنستے کھیلتے ہوئے لکھنا چاہئے۔ **شبانہ صدف، صادق آباد۔** جنوری کے شمارے میں محمد عادل منہاج، بن یامین اور محمد بن ملک کی تحریریں لاجواب تھیں۔ **محمد احسن اعوان، صدیقہ احمد، ملتان۔** اس بار لطیفے پیٹ میں بل ڈالنے والے تھے۔ **ثنا حسین، منصور احمد۔** ٹیکسلا۔ ہم دونوں بہن بھائی آپ کا رسالہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ پچھلے شمارے میں ہمارا نام چھاپنے کا شکریہ! **محسن یٰسین، احسن یٰسین، کراچی۔** آپ ایک سال میں کتنے خاص نمبر چھاپتے ہیں؟ ○ ..... عام طور پر دو اور کبھی تین۔ **شہزاد واسطی، لاہور۔** آنکھ مچولی میں پاکستان کے تمام علاقوں کے بچوں کو نمائندگی دی جاتی ہے جو اچھی بات ہے۔ **عبدالرحمٰن غوری، عمر کوٹ۔** آنکھ مچولی میں اپنا لطیفہ شامل دیکھا تو دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ **ارم ارشد، کراچی۔** اس مہینے کا آنکھ مچولی بہت ہی دلچسپ تھا۔ **عبدالرؤف عادل، پنجگور۔** اب اگلا خاص نمبر

کب نکال رہے ہیں؟ ○ ...... ابھی شرارت نمبر کی تھکن اتری بھی نہیں اور آپ نے اگلے نمبر کی فرمائش شروع کر دی۔ ابو ذر معاویہ فاروقی، میلسی۔ اس بار آنکھ مچولی میں تحریروں کا انتخاب خاص نہ تھا ......!! شبنم حنا، کراچی۔ آنکھ مچولی میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ کمل کمار آہوجا، کندھ کوٹ۔ انکل! مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ میرا خط نہیں چھاپتے۔ پرنس عمر ریاض ساگری، جہلم۔ آنکھ مچولی ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا ملا۔ تمام تحریریں پسند آئیں۔ ہما جبیں، مظفر گڑھ۔ انکل! آپ کا اداریہ سچ مچ بہت اچھا ہوتا ہے۔ فائزہ حسن، کراچی۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیاں بھی پسند آئیں۔ عائشہ عمر، پشاور۔ آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ دل موہ لینے والا تھا۔ تمام کہانیاں سبق آموز اور دل پر نقش کرنے والی تھیں۔ محمد زاہد سلیم، کراچی۔ شمارے کے ساتھ ملنے والا تحفہ بہت اچھا لگا۔ شاہد اقبال تبسم، میٹھہ خیل کرک۔ یہ میرا پہلا خط ہے ...... مایوس نہ کیجئے گا!! صائمہ مسعود، سیالکوٹ۔ آپ نے میرا خط نہ چھاپا تو میں آنکھ مچولی پڑھنا چھوڑ دوں گی۔ کامران غوری، کراچی۔ آنکھ مچولی کی کچھ تحریروں کے الفاظ اتنے مشکل ہوتے ہیں کہ پڑھنے کے بعد پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے ظاہر ہے ہضم ہی نہیں ہوتے۔ ○ ...... تو بھئی آپ ہاضمے کی گولیاں کھالیا کریں ...... خیر یہ تو مذاق کی بات ہوئی اصل بات یہ ہے کہ نئے نئے الفاظ آپ کو آنے چاہئیں۔ سعدیہ یاسمین، راولپنڈی۔ آپ نے میری کہانی کو رسالے میں جگہ دی۔ بہت شکریہ! انکل! آپ ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو شائع کریں۔ ○ ...... آپ کی تجویز پر ضرور غور کریں گے۔ منزہ یوسف، لاہور۔ آنکھ مچولی پڑھا۔ دیگر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ سرورق بہت پسند آیا۔ عنبرین سعید، کراچی۔ آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ بہت اچھا تھا، پسند آیا۔ اسما اصغر، راولپنڈی۔ پچھلے دنوں میرا گزر ایک مصروف شاہراہ سے ہوا تو میری نظر ایک بس پر پڑی جس کے پیچھے اسکول کے لڑکے لٹکے ہوئے تھے ان میں سے ایک لڑکا چلتی بس سے نیچے گر گیا اور بہت ہی بری طرح زخمی ہو گیا۔ بسوں میں اس طرح لٹکنے سے جان بھی جا سکتی ہے۔ اگر ایک بس میں جگہ نہ ملے تو دوسری بس کا انتظار کر لینا چاہئے!! قرۃ العین عزیز، حافظ آباد۔ میری تحریر "نیلے آنسو" آپ کو ملی یا نہیں؟ ○ ...... بھئی! لگتا ہے "نیلے آنسو" ڈاک والوں نے ہم تک پہنچنے سے پہلے ہی پونچھ دیئے اسی لئے آپ کی تحریر نہیں ملی۔ زینو شرف، کراچی۔ میری طرف سے راحت صلاح الدین کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ ○ ...... اس خط کے ذریعے آپ کا سلام راحت تک پہنچ جائے گا۔ صبغۃ اللہ احسن، سرگودھا۔ رسالے کا معیار پہلے کافی اچھا تھا۔ اب آپ اس پر توجہ کم دے رہے ہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔ فرزانہ عبد الباری، کراچی۔ کیا آپ نئے لکھنے والوں کی کہانیاں شائع کرتے ہیں؟ ○ ...... کیوں نہیں! محمد آصف بن شرف، پنجگور۔ میری دعا ہے کہ آنکھ مچولی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔ حمیرا نایافت، کورنگی (کراچی) آج کل پلاسٹک کی تھیلیوں کا رواج چل نکلا ہے۔ ان کا فائدہ تھوڑا اور نقصان زیادہ ہے۔ انہیں تلف کرنے کا مکمل طریقہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ یہ درختوں، جھاڑیوں پر لپٹی اور اڑتی نظر آتی ہیں۔ جلانے پر فضائی آلودگی کا سبب بنتی ہیں۔ سیوریج لائنوں میں چلی جائیں تو سیوریج کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس سے بچاؤ کا ایک ہی علاج ہے کہ اس کے استعمال کی حوصلہ شکنی کی جائے اور کاغذ والی تھیلیاں استعمال کی جائیں ......!! ضیاء الرحمٰن مروت، تترخیل۔ آنکھ مچولی میرا پسندیدہ رسالہ ہے جسے میں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ عثمان صدیق، کراچی۔ اگر میں آپ کے رسالے کی تعریف لکھنے بیٹھ گیا تو آپ اسے پڑھتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر جائے گا ......!! ○ ...... اور پھر بھی آخر میں یہ لکھا ہوگا (باقی آئندہ) عامر خالق، ایبٹ آباد۔ انکل! ردی کی ٹوکری کے کیا حال ہیں ...... کہیں فاقے سے تو نہیں؟ ○ ...... آپ لوگ اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں پھر بھلا وہ فاقہ کیسے کر سکتی ہے۔

آنکھ مچولی البم

ہم میں پیار محبت بھی ہے، دنیا کو بتلائیں آؤ گلے مل جاؤ ساتھی، ہم بھی عید منائیں

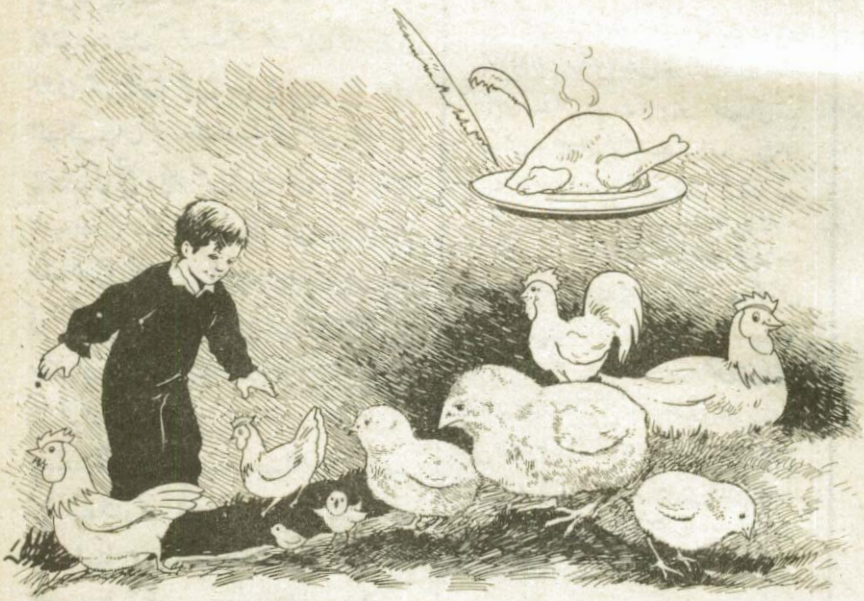

محمد بن مالک

فلسفی چوزہ

گڈو میاں کو چوزے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ننھے ننھے روئی کے گالوں کی مانند شوخ و شریر اور چنچل چوزے، جب اُن کے گھر کے صحن میں اِدھر سے اُدھر چھلانگیں لگاتے پھرتے تو گڈو میاں کی مسرّت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ وہ گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھے اُنہیں کھیلتا دیکھتے رہتے۔ مگر ایک مسئلہ چوزوں کی حفاظت کا تھا۔ چوزے اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ہی گڈو میاں چوبیس گھنٹے اُن کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ آخر اُنہیں اپنی پڑھائی اور دوسرے کام بھی تو کرنے ہوتے تھے۔ چوزے دڑبے میں بھی غیر محفوظ تھے۔ رات کو جب گڈو میاں اپنے گھر والوں کے ساتھ نیند کے مزے لے رہے ہوتے، بلّی صاحبہ اُن کے گھر کی بیرونی دیوار پھلانگ کر صحن میں آ کودتیں۔ پھر بڑے آرام سے دڑبے کا دروازے کھول کر اپنی پسند کا کوئی چوزہ منتخب کرتیں اور اسے منہ میں دبا کر رفوچکر ہو

جاتیں۔ چوزے لاکھ چیخیں زور زور سے "چوں چوں ..... چوں" کرتے مگر گڈو میاں خود نیند کی وادی میں طرح طرح کے چوزوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہے ہوتے پھر اُنہیں بھلا اپنے چوزوں کی چیخ و پکار کس طرح سنائی دیتی! چنانچہ جب وہ صبح سو کر اٹھتے تو روز اُنہیں ایک چوزہ کم ملتا۔ اور یہی نہیں..... کئی ایک دیدہ دلیر بلّیاں تو اُن کی "نگرانی" کے کام کے دوران بھی اپنا کام دکھا جاتیں اور بڑی تیزی کے ساتھ جھپٹا مار کر کوئی چوزہ پکڑ کر فرار ہو جاتیں۔ گڈو میاں دیکھتے ہی رہ جاتے۔ نتیجتاً اُن کے لائے ہوئے تمام چوزے ایک مہینے کے اندر اندر بلّیوں کی نذر ہو جاتے۔ گڈو میاں اپنے چوزوں کی حفاظت کے نئے نئے منصوبے بناتے مگر ہر مرتبہ اُن کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے شاید اُن کو محلے کی بلیوں کے رزق کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔

گڈو میاں کو اپنے چوزوں کے "مستقبل" سے زیادہ ان کے "حال" کی فکر تھی کیونکہ جب بلیاں اپنی مہارت کی بدولت چوزوں کے مستقبل کو ہمیشہ کے لئے تاریک کر دیتیں تو گڈو میاں بری طرح "بے حال" ہو جاتے۔ چنانچہ اب وہ گزشتہ چند دنوں سے اپنے چوزوں کی حفاظت کے سلسلے میں سخت فکر مند نظر آ رہے تھے۔ جب گڈو میاں کے پاس چوزوں کا نیا "اسٹاک" بھی ختم ہو گیا تو ان کی فکر میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ابو جان کو اپنے لاڈلے بیٹے کا "مُفکّر" بننا گوارا نہیں تھا۔ اس

مجبوری

واشنگٹن — ۲۲ جولائی — امریکہ کے ماحولیات کے اعلیٰ افسر سائنس دانوں اور صحت سے متعلقہ گروپوں نے اس رپورٹ کی پرزور حمایت کی ہے جس میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ہزاروں بچے اور بڑے دوسروں کے استعمال شدہ سگریٹ کے دھوئیں سے متاثر ہو کر یا تو مر جاتے ہیں یا بیمار ہو جاتے ہیں۔ ماحولیات کے تحفظ کا ارادہ ای پی اے عنقریب عوام میں ایسے پمفلٹ تقسیم کرے گا جس پر سگریٹ پینے والوں پر زور دیا جائے گا کہ وہ اپنے گھروں، کام کرنے کی جگہوں اور ہوٹلوں میں ایسے افراد کو تحفظ فراہم کریں جو غیر اختیاری طور پر ماحول میں موجود ان کے تمباکوں کے دھوئیں کو پینے پر مجبور ہیں۔ ای پی اے نے جنوری میں شائع کی جانے والی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ تمباکو پینے والوں کے منہ سے نکلنے والے دھوئیں اور سگریٹ، سگار پائپ سے براہ راست نکلنے والے دھوئیں سے ہر سال تقریباً ۳۰۰۰ سگریٹ نہ پینے والے لوگ پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ اور ہر سال ۱۵۰۰۰۰ اور ۳۰۰۰۰۰ کے درمیان چھوٹے بچے جن کی عمریں ۱۸ ماہ سے کم ہوتی ہیں، سانس کی تکلیف کے باعث ہسپتال میں داخل کئے جاتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق دو لاکھ سے دس لاکھ تک ایسے بچے سانس کی تکلیف کے شدید عارضے سے دو چار ہو جاتے ہیں جو اپنے والدین یا دوسرے سگریٹ پینے والوں کا دھواں اپنی سانس کے ساتھ اندر لے جاتے ہیں۔ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن، امریکن لنگ ایسوسی ایشن، امریکن ہارٹ ایسوسی ایشن اور امریکن کینسر سوسائٹی کے نمائندوں نے ای پی اے کی رپورٹ کی تصدیق کرتے ہوئے اسے درست قرار دیا ہے۔

مرسلہ ..... غلام عباس طاہر، شورکوٹ

لئے وہ گڈو کے لئے انڈے دینے والی ایک دیسی مرغی خرید لائے اور گڈو سے کہا کہ لو میاں! تمہارے ایک ٹکٹ میں تین مزے ہو گئے۔ یعنی ناشتے میں اگر انڈے کھانے کو جی چاہے تو وہ مفت! اس کے علاوہ "بچے کھچے" انڈوں میں سے بذریعہ مرغی ننھے ننھے چوزے بھی بر آمد کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح چوزوں کی حفاظت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ مرغی کی موجودگی میں کس بلی یا چیل کی بھلا کیا مجال کہ وہ چوزوں پر بری نظر بھی ڈال سکے۔!!

گڈو میاں بہت خوش ہوئے اور فوراً ہی "آنے والے" چوزوں کے بارے میں شیخ چلی کی طرح منصوبے بنانے لگے۔ مگر وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے یعنی ہفتے میں تین انڈے وہ خود کھاتے اور تین انڈے مرغی کے سینے کے لئے الگ رکھ دیتے۔ جب مرغی کڑک ہو گئی (یعنی اس نے انڈے دینے بند کر دیئے اور وہ انڈے سینے کے قابل ہو گئی) تو گڈو میاں نے انڈے لے جا کر اس کے دڑبے میں رکھ دیئے مرغی دن رات اُن انڈوں کو سیتی رہتی۔ آخر کچھ عرصے کے بعد ایک درجن انڈوں سے چوزے نکل آئے۔ باقی انڈے خراب نکلے۔ گڈو میاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ شوخ رنگوں کے ننھے ننھے چنچل اور شریر چوزے دن بھر ادھر سے ادھر کلیلیں کرتے پھرتے اور جہاں کوئی ایسی ویسی بات دیکھتے فوراً اپنی اماں کے پروں میں جا چھپتے۔ مرغی "کٹ کٹ" کرتی بڑے فخریہ انداز میں اپنے چوزوں کو دیکھتی اور پھر اپنے پروں کو پھیلا کر انہیں پروں میں سمیٹ لیتی۔

چوزے چونکہ مرغی کی وجہ سے بالکل محفوظ تھے اس لئے گڈو میاں اب انہیں صحن کے علاوہ اپنی پچھلی گلی میں بھی کھول دیتے تھے جہاں وہ تمام وقت اپنی ماں کے ساتھ دانہ چگتے رہتے۔ بلیاں چوزوں کی معصوم آوازیں سن کر لپکی ہوئی وہاں آتیں مگر ان کے ساتھ ایک عدد موٹی تازی مرغی دیکھ کر دور ہی سے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتیں۔ مرغی اپنے چوزوں کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جہاں اس کی نظر چوکی، وہیں کوئی نہ کوئی چوزہ غائب۔ اسی لئے چوزوں کو وہ ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتی تھی۔ یوں گڈو میاں کے شوق کی تسکین بھی ہو رہی تھی اور مرغی کی ممتا کو بھی قرار تھا۔

درجن بھر چوزوں میں سے گیارہ چوزے تو نہایت شوخ و شنگ اور شریر تھے اور ہر وقت ادھر سے ادھر بھاگتے دوڑتے، اچھلتے کودتے رہتے تھے بالکل کسی فٹ بال ٹیم کے کھلاڑیوں کی طرح جبکہ بارہواں چوزہ نہایت سست واقع ہوا تھا، بالکل کسی کرکٹ امپائر کی طرح۔ وہ آنکھیں بند کئے ایک جگہ سوچوں میں گم کھڑا رہتا تھا۔ اپنے بھائی بندوں کے شور یا اپنی ماں کی ڈانٹ کی آواز سن کر اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا تو وہ آنکھیں کھول کر ذرا دیر کو ادھر ادھر دیکھ لیتا ..... پھر دوبارہ

آنکھیں بند کر کے اپنے خیالات میں گم ہو جاتا۔

مرغی جہاں اپنے گیارہ چوزوں کی شرارتوں سے نالاں تھی وہاں اپنے اس آخری چوزے کی سستی اور کاہلی سے بھی سخت پریشان تھی۔ وہ جب اسے ایک جگہ آنکھیں بند کئے کھڑا دیکھتی تو اس کا پارہ چڑھ جاتا۔ وہ اسے دو چار ٹھونگیں مار کر غصے سے گڑگڑاتی ہوئی آواز میں کہتی "ارے کم بخت! تو کھڑا کیا سوچتا رہتا ہے آخر! ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں تجھے اس دنیا میں آئے ہوئے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تو کسی انسان کے ہاں پیدا ہو جاتا..... افلاطون کہیں کا! سوچنا اور غور و فکر کرنا تیرا کام نہیں، تو چوزہ ہے، مرغا بن فلسفی نہ بن۔"

پھر مرغی دوسرے چوزوں کی طرف اشارہ کر کے کہتی "ذرا دیکھ تو اپنے بھائیوں کو! کھا کھا کر کس قدر موٹے اور لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور ایک تو ہے..... نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا، ویسے کا ویسا ہی ہے جیسا پیدا ہوا تھا..... چل جا، جا کے کچھ دانہ دنکا کھا!!"

فلسفی چوزا مجبوراً چاول کے چند دانے "زہر مار" کرتا، تھوڑا سا پانی پیتا اور پھر ایک کونے میں کھڑا ہو کر دوبارہ خیالات میں غرق ہو جاتا۔

مرغی کی طرح گڈو میاں بھی اپنے اس چوزے کے متعلق سخت فکر مند تھے۔ وہ ایک طرف کھڑے ہو کر "کُٹ کُٹ" کی آواز منہ سے نکالتے تو تمام چوزے ان کی طرف دوڑے ہوئے آتے۔ بس ایک فلسفی چوزہ ٹس سا اپنی جگہ کھڑا رہتا۔ گڈو میاں لاکھ آوازیں نکالتے، دانہ دنکا پڑا ہوا دکھاتے مگر فلسفی چوزہ اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔

چوزے اب خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ گڈو میاں انہیں پچھلی گلی میں کھولتے تو مرغی اپنے سپوتوں کو ساتھ چمٹائے رکھنے کے بجائے ایک طرف بیٹھ کر ان کی کارکردگی کا جائزہ لیتی رہتی۔ کیونکہ چوزے اب کسی حد تک خود اپنی حفاظت کے قابل ہو گئے تھے۔ البتہ مرغی فلسفی چوزے کے لئے کچھ فکر مند تھی کیونکہ وہ دوسرے چوزوں کے مقابلے میں خاصا چھوٹا لگتا تھا۔

فلسفی چوزے نے اب کسی حد تک کھانے پینے کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ سوچنے اور غور و فکر کرنے سے بھوک کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن مرغی اب بھی اس سے ناخوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ فلسفی چوزہ اسی طرح کھائے پیئے جس طرح اس کے بھائی بند کھاتے پیتے ہیں۔ فلسفی چوزہ کہتا تھا کہ صرف اتنا کھانا چاہئے جتنی کہ ضرورت ہو، زیادہ کھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس پر مرغی اور دوسرے چوزے اس سے خوب بحث کرتے کہ بتاؤ بھئی زیادہ کھانے کا نقصان کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں دیکھو کھا کھا کر کس قدر صحت مند اور موٹے تازے ہو گئے ہیں۔ تو کیا یہ نقصان کہلائے گا؟ فلسفی چوزہ کہتا کہ مٹاپا، تندرستی نہیں بلکہ یہ تو خود ایک بیماری ہے۔

کچھ ہی عرصے بعد چوزوں کے سروں پر کلغیاں اور کچھ کی ٹھوڑیوں پر ڈاڑھیاں نمودار ہو گئی تھیں۔

چند ایک چوزے تو بانگ بھی دینے لگے تھے۔ یعنی سب کے سب، چوزوں سے اب مرغوں مرغیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ فلسفی مرغے کے مقابلے میں اس کے گیارہ بہن بھائی بے حد موٹے اور فربہی مائل تن و توش رکھتے تھے۔ جب کہ فلسفی چوزہ نسبتاً سڈول اور چھریرے بدن کا مالک تھا۔ مرغی بھی اب خاصی بوڑھی ہو چکی تھی۔ ایک دن جبکہ گڈو میاں کے گھر بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے تو گھر والوں نے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کے لئے مرغی کو ذبح کر کے اس کا قورمہ پکا لیا۔ گڈو میاں اب بھی اپنے مرغے مرغیوں کا خیال رکھتے تھے لیکن جب وہ مرغوں کا جائزہ لیتے تو انہیں ان پر بالکل بھی پیار نہ آتا۔ کیونکہ وہ بڑے ہو گئے تھے۔ گڈو میاں کو تو صرف ننھے ننھے شریر چوزے ہی بھاتے تھے۔ ایک دن جب وہ اسی طرح مرغوں کے پاس بیٹھے ان کا جائزہ لے رہے تھے تو اچانک ان کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور انہوں نے ابو کے پاس جا کر کہا۔ "ابّو آپ فی الحال بازار سے گوشت لانا چھوڑ دیجئے۔"

"کیوں بھئی مرغی کا گوشت پسند نہیں آتا آپ کو؟" ابو نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں ابو، یہ بات نہیں ہے جب ہمارے گھر میں اتنے سارے مرغے مرغیاں موجود ہیں تو ہمیں بازار سے مرغی کا گوشت خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب تک یہ گھر میں ہیں ہم انہیں کو ذبح کر کے کھاتے رہیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا ابو!"

"ٹھیک ہے بھئی..... لیکن ..... کیا آپ کو اب چوزے پالنے کا شوق نہیں رہا؟"

"چوزے پالنے کا شوق تو ہے ..... مرغے پالنے کا نہیں۔" گڈو میاں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اوہو اچھا میں سمجھ گیا۔" ابو مسکرائے۔

"اور کیا ابو! اتنے بڑے بڑے مرغے مرغیاں اچھے ہی نہیں لگتے۔ جب یہ مرغے مرغیاں ختم ہو جائیں گے تو ہم ایک مرغی کے ساتھ فلسفی مرغے کا جوڑا بنا دیں گے کیوں کہ وہ ان موٹے مرغوں میں سب سے دبلا پتلا ہے اور اس میں سے کوئی خاص گوشت بھی نہیں نکلے گا۔ کیوں ٹھیک ہے ناں ابو؟" "ہاں ہاں! بھئی ٹھیک ہے۔" ابو نے کہا اور.....

گڈو میاں دوبارہ جا کر اپنے مرغوں کو دیکھنے لگے۔ فلسفی مرغا ایک طرف اطمینان سے بیٹھا غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک ہی اس کے بہن بھائی کھانے پینے میں مشغول تھے۔ گڈو میاں ان گیارہ بہن بھائیوں کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کھا کھا کر کیا جان بنا لی ہے انہوں نے ..... ہر ایک میں سے کم از کم دو کلو گوشت تو ضرور نکلے گا..... !!

گزشتہ ماہ قاسم بن ظفر کی خوب صورت کہانی "بلا عنوان" پیش کی گئی تھی۔ ساتھیوں کی کثیر تعداد نے اچھے اچھے عنوانات ارسال کئے لیکن تین بہترین عنوان جو انعام کے حقدار قرار پائے، درج ذیل ہیں:

(۱) "اندھیر نگری" منور حسین رانا، کراچی
(۲) "آکٹوپس" عبدالرشید، حیدرآباد
(۳) "اندھیر" فرحان خالق، کراچی

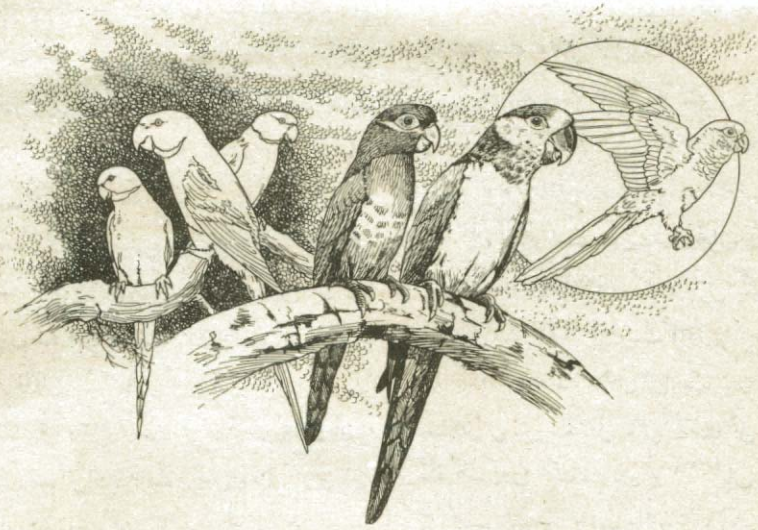

توتے کس طرح باتیں کرتے ہیں؟

نگہت آرا چوہان

لوگ طوطوں کو بولتے دیکھ کر بڑے حیران اور خوش ہوتے ہیں لیکن ابھی تک کوئی یہ وضاحت نہیں کر سکا ہے کہ یہ پرندے انسانوں کی اتنی کامیاب نقل کس طرح اُتار لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ طوطے اپنے زبان کی ساخت کی وجہ سے جو لمبی اور موٹی ہوتی ہے، بول لیتے ہیں۔ لیکن پرندے کے بولنے کے لئے ایسی زبان کا رکھنا لازمی شرط نہیں ہے۔ دوسرے بولنے والے پرندے مثلاً مینا، عام کوے اور پہاڑی کوے کی ایسی زبان نہیں ہوتی۔ دوسری طرف باز اور عُقاب کی ایسی زبان ہوتی ہے مگر وہ بول نہیں سکتے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ طوطے دوسرے پرندوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بہت سے ماہرینِ حیاتیات کا خیال ہے کہ طوطے اور دوسرے بولنے والے پرندے ان باتوں کا مطلب

بالکل نہیں سمجھتے جو وہ کہہ رہے ہوتے ہیں لیکن وہ کچھ صوتی اثرات کی نقل کامیابی سے اُتار لیتے ہیں۔

طوطوں کے لئے بولنا آسان ہے کیونکہ ان کی آواز کا میکانیکی نظام اور سُننے کی صلاحیت دوسرے پرندں کی نسبت آہستہ ہوتی ہے اور انسان جو آوازیں پیدا کرتے ہیں وہ طوطوں کی اپنی آواز سے ملتی جلتی ہوتی ہیں چنانچہ انسانی آوازوں کی نقل اتارنا طوطوں کے لئے ممکن ہو جاتا ہے۔

طوطے دوسری باتوں میں بھی کافی حیرت انگیز ثابت ہوئے ہیں۔ وہ ہر طرح کے حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں چنانچہ اکثر دور دراز کا سفر کرنے والے جہاز راں اپنے ساتھ طوطے لے جاتے ہیں۔ اگرچہ طوطا استوائی خطّے کا پرندہ ہے لیکن قید کی حالت میں یہ ہر قسم کے درجۂ حرارت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ میاں مٹھو بہت بہادر اور اپنے ہم جنسوں کے وفادار ہوتے ہیں۔ اگر کسی گروپ کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو سارا جُھنڈ مل کر مُقابلہ کرتا ہے۔ (یعنی طوطے آپس میں طوطا چشمی کا مظاہرہ نہیں کرتے) کھانے پینے کی تلاش کرتے ہوئے طوطے بندروں کی طرح درخت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگ لگاتے ہیں اور اپنی چونچ اور پاؤں کو اس عمل میں استعمال کرتے ہیں۔ طوطے اپنے پیروں کو کھانے کے دوران ہاتھوں کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں اکثر گھروں میں طوطے بڑے شوق سے پالے جاتے ہیں اور انہیں باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ بچّے بھی ان سے پیار کرتے ہیں اور ان کے انسانوں کی طرح باتیں کرنے پر حیران ہوتے ہیں.....!!!

آدم خور پودے

وینس فلائی ٹریپ انتہائی خوب صورت پودا ہے یہ امریکہ میں گیلی جگہوں پر پایا جاتا ہے۔ اس کے پتے پھندے کا کام دیتے ہیں جس سے یہ کیڑے مکوڑوں کو پکڑ کر کھا جاتا ہے۔

پچر پلانٹ ہمالیہ اور جزیرہ ملایا میں پایا جاتا ہے۔ اس کے لیمینا کے ساتھ ایک صراحی سی بنی ہوتی ہے جس کے منہ پر ڈھکنا ہوتا ہے۔ منہ کی اندرونی سطح پھسلنی ہوتی ہے جب کوئی کیڑا مکوڑا اس کے منہ پر بیٹھتا ہے تو وہ پھسل کر صراحی کے اندر چلا جاتا ہے اور یہ پودا مختلف رطوبتیں نکال کر اسے ہضم کر لیتا ہے۔

بچھو کی طرح ڈنک مارنے والا درخت

فرانس اور امریکہ میں بعض مقامات پر جاندار کو قریب پا کر بچھو کی طرح ڈنک مارنے والا درخت پایا جاتا ہے جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور عام طور پر جاندار کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

بالوں والا درخت

آسٹریلیا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے پتے انسانی بال جیسے ہوتے ہیں۔ اسے آسٹریلیا میں ہیر ٹری یعنی بالوں والا درخت کہا جاتا ہے۔

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں اس لئے واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔ کوئی بھی تحریر بھیجتے وقت اس کی ایک نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ (ادارہ)

"خالہ جان" فوزیہ یاسمین (؟) محمد بن موسیٰ الخوارزمی "طاہر روشن، کراچی۔ "پیارے وطن" ربیعہ فاروقی، جھنگ۔ "میرا وطن" محمد صفدر عباس، ساہیوال۔ "فرعون کی خدائی" سید محمد علی، شیخوپورہ۔ "شریر کہیں کا" خلیل جبار، حیدر آباد۔ "ہڈی میں گودا" سید اطہر جمال، کراچی۔ "شرارتی بچہ" محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ "شرارت جیری کی" حسیب احمد، جہلم۔ "ہماری شرارتیں" طارق محمود، راولپنڈی۔ "آخری شرارت" محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ "ہم اور ہماری شرارت" محمد یوسف انجم، بورے والا۔ "ماضی اور مستقبل کا مورخ" محمد یوسف انجم بورے والا۔ "شرارت بھی ذہانت بھی" عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ۔ "بچپن کی شرارت" محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ "آزادی ایک نعمت ہے" خرم طارق جگنو، گوجرانوالہ۔ "ایسا بھی ہوتا ہے" احمد عظیم خان درانی، کٹور کوٹ۔ "شادی خانہ آبادی" (؟)۔ "بھیا شرارتی سے انٹرویو" سید سفیان تباہی، اسلام آباد۔ "شرارت یا فراڈ" عارف شمین روہیلہ، حیدر آباد۔ "ہم نے پہاڑہ یاد کیا" مہرین حیدر، کراچی۔ "پچھتاوا" محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ "ہماری شرارت" محمد جعفر صدیقی، میرپور خاص۔ "شرارت یا" محمد جبران عبد القیوم، حیدر آباد۔ "دو خواہشیں" متین بینا، مکران، "عہد" وردہ جاوید، لاہور۔ "آسیب" محمد اسماعیل" ڈیرہ غازی خان۔ "نیا سال کی انگلیوں پر" محمد عرفان احمد، کراچی۔ "قاتل کون" محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ "انوکھی شرارت" محمد فاروق منیر، لاہور۔ "نیا عزم" (؟) "چھٹی کی خاطر" محمد بلال، سوات۔ "آرام و سکون" سید عثمان علی ہاشمی، کراچی۔ "سب سے طاقتور" محمد انور خان، کوٹ گلان۔ "عیادت" عمیر اقبال خان، کراچی۔ "آخر کب تک" محمد علی صدیقی، میاں چنوں۔ "نعت" محمد جبران عبد القیوم، حیدر آباد۔ "بلا عنوان" محمد حسین، نواب شاہ۔ "بہادر علی" طالب رضا، کراچی۔ "نعت" "کرکٹ" سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔ "میاؤں میاؤں" "میری گڑیا" بینش میمن، حیدر آباد۔ "جاسوس بچے" نواز افتخار بیگ، کراچی۔ "عذاب الٰہی" محمد خاور تبسم، جہلم۔ "ننھے نک کا خواب" عدیل عثمان، حیدر آباد۔ "کشمیر ہم تیرے نگہبان" محمد فیاض احمد، کراچی۔ "ہیرے کی قیمت" سلیمان زکریا، لاہور۔ "آنکھ مچولی" عمران داؤد، کراچی۔ "نگو کی شرارت" اختر منیر عقاب، مردان "داستان مجاہد" فتح محمد عرشی، میانوالی۔ "سنہرے سکوں کی چوری" الماس زریں، کراچی۔ "سب سے بڑا انتقام" محمد ادریس، پشاور۔ "بھوت والی شرارت" فہد آفتاب، کراچی۔ "ہم بنے جاسوس" جمشید احمد، کراچی۔ "شہزادہ اور جن" عمارہ سلیم (؟) "ہمت" عرفان امیر، لاہور۔ "شرارت" نوید مرزا، لاہور۔ "اچھی شرارت" سائرہ کنول ثنا، کوئٹہ۔ "پان کھانے کے فائدے" طارق محمود اعوان، گولارچی۔ "منگائی" محمد حسن معظم، لاہور۔ "توبہ" عدیل رضا، تلہ گنگ۔ "سازش" نبیل مرزا، کراچی۔ "گریباں چاک" عبد الباسط عمران ظفر، ڈسکہ۔ "آسمانی بجلی" احمد مجتبیٰ خاں سواتی، میرپور۔ "کشمیر کا حق" زاہدہ پروین، فیصل آباد۔ "ماں کی ممتا" محمد اکبر، راولپنڈی۔ "جادو والا درخت" ہما قیوم، پشاور۔

چیونٹی کا گیت

حفیظ الرحمٰن احسن

چیونٹی ہوں، میں چیونٹی ہوں دیکھو تو ننھی سی ہوں
ہر دم چلتی رہتی ہوں دکھ محنت کے سہتی ہوں
صبح کہیں تو شام کہیں پل بھر کو آرام نہیں
کام سے میں تھکتی ہی نہیں رکنے کی فرصت بھی نہیں
کام مرا تم کیا جانو غور سے دیکھو تو سمجھو
جب موسم ہو گرمی کا فکر مجھے ہو سردی کا
سردی آنے سے پہلے پہلے بارش آنے سے
دانہ دنکا چنتی ہوں چنتی ہوں، سر دھنتی ہوں
سب سامان ضرورت کا کر لیتی ہوں میں یکجا
پھر برسات کے آنے پر سردی کے چھا جانے پر
چین سے بیٹھ کے کھاتی ہوں مالک کے گُن گاتی ہوں
ویسے تو چھوٹی سی ہوں لیکن کتنے کام کی ہوں
محنت کے دُکھ سہتی ہوں اپنی دُھن کی پکّی ہوں
چیونٹی ہوں، میں چیونٹی ہوں
دیکھو تو ننھی سی ہوں

بچاؤ

چودھویں قسط

اشتیاق احمد

انسپکٹر جمشید کی غیر موجودگی میں بچے گھر پر اکیلے تھے کہ پروفیسر عمران جاہ زخمی حالت میں گھر کے اندر داخل ہوئے۔ دشمن بھی ان کے تعاقب میں یہاں آن پہنچا۔ ایک طویل ذہنی اور جسمانی جنگ کے بعد بالآخر دشمن کو قابو کر لیا گیا۔ انسپکٹر جمشید واپس گھر پہنچے تو میدان صاف ہو چکا تھا۔ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد وہ فوج کی مدد سے اپنے ساتھیوں سمیت شہر کی محفوظ ترین عمارت میں منتقل ہو گئے۔ انشارجہ کا زلزلہ بہت چالاک تھا۔ وہ پے در پے چالیں بدل کر عمارت کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت وہ انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں تھا۔ لیکن بظاہر معصوم نظر آنے والے بچے اس کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوئے اور وہ پیکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ بالآخر صدر صاحب کے انشارجہ سے واپس آنے پر پیکٹ ان کے حوالے کرنے سے پہلے پروفیسر عمران جاہ نے اپنی طویل کہانی کا آغاز کیا اور بتایا کہ وہ کس طرح اور کیوں انشارجہ سے وہ پیکٹ لے کر بھاگے۔ رابل کے چہرے سے میک اپ صاف کیا گیا تو معلوم ہوا وہ نقلی تھا۔ پروفیسر عمران جاہ کے اس اعلان پر اصلی رابل بھی اس کمرے میں موجود ہے۔ سب لوگ حیرت سے چلا اٹھے۔

(اب آپ آگے پڑھئے)

کمرے میں موت کا سناٹا طاری تھا..... وہ سب پروفیسر عمران کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے..... آخر صدر صاحب نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔

"یہ آپ نے کیا کہا..... رابل اس عمارت میں آچکا ہے..... آپ کو کیسے پتا چلا اس بات کا..... آپ تو اس کمرے میں موجود ہیں..... دوسرے یہ کہ آپ نے کہا ہے..... آپ کے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے۔"

"جی ہاں! میں نے غلط نہیں کہا۔"

"تب پھر یہی شخص رابل ہے..... جس کے چہرے پر سے آپ نے انسپکٹر جمشید کا میک اپ اتارا ہے۔"

"لیکن اس کا چہرہ تو اس تصویر سے نہیں ملتا۔" محمود نے کہا۔

"ہاں نہیں ملتا..... اور نہ یہ رابل ہے..... یہ رابل کا ایک ادنیٰ خادم ہے..... اور اس کا نام ہے ٹامی۔"

"ٹامی!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں! یہ دیکھئے..... اس بیگ میں ایک اور تصویر موجود ہے....." یہ کہہ کر پروفیسر عمران جاہ نے دوسری تصویر نکال کر ان کے سامنے کر دی۔

وہ واقعی اس آدمی کی تصویر تھی..... جو، ان کے سامنے کرسی پر بندھا ہوا تھا۔

"چلئے..... یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ رابل نہیں..... ٹامی ہے..... اب سوال یہ ہے کہ رابل کہاں ہے..... ابھی آپ نے کہا کہ رابل بھی اس عمارت میں آچکا ہے۔"

"لیکن عمارت میں..... اس کمرے میں تو نہیں آیا۔" محمود بولا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ رابل اس کمرے میں بھی آچکا ہے تو؟" پروفیسر عمران جاہ بول اٹھے۔

"کیا!!!" وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چلائے۔

"آپ پاگل تو نہیں ہو گئے!!" صدر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"جی نہیں سر..... ابھی نہیں ہوا لیکن شاید ہو جاؤں۔" وہ بولے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"انشارجہ جیسی طاقتیں تو یہی چاہتی ہیں کہ مجھ جیسے لوگ اول تو اس ملک میں پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہو جائیں تو انہیں پاگل کر دیا جائے..... ان کی برین واشنگ کر دی جائے....."

"اگر رابل یہاں اس کمرے میں موجود ہے..... تو پھر اتنی دیر کیوں..... جلدی بتائیں..... وہ کون ہے؟" صدر صاحب نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

"یہ بہت حیرت انگیز اور دھماکا خیز ہو گا۔"

"لیکن ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کرنا کرانا کیا ہے..... صبر ہی کر سکتے ہیں۔" محمود بولا۔

"تم لوگ خاموش رہو ..... اس وقت حد درجے سنجیدہ بات ہو رہی ہے۔" صدر صاحب نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! آپ نے ٹھیک کہا ..... بہت زیادہ سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے ..... موت کی حد تک سنجیدہ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو پھر بتائیں نا ..... رابل یہاں کون ہے ؟" صدر صاحب نے تیز لہجے میں کہا۔

"بتانے کی ضرورت نہیں ..... خود بخود یہ بات ظاہر ہو جائے گی ..... جاؤ فرزانہ ..... پیکٹ نکال کر لاؤ۔"

"جی کیا فرمایا ..... پیکٹ نکال کر لاؤں!؟"

"ہاں! پیکٹ لے آؤ ..... اور صدر صاحب کے حوالے کر دو۔" پروفیسر عمران جاہ بولے۔"

"لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ پیکٹ میں نے چھپایا ہے؟"

"یہ میرا اندازہ ہے ..... اگر تم نے نہیں چھپایا تو پھر محمود لے آئے ..... فاروق لے آئے۔" وہ بولے۔

"اچھی بات ہے ..... اگر آپ کہتے ہیں تو لے آتی ہوں ..... لیکن کیا آپ سوچ چکے ہیں ..... یہاں رابل موجود ہے۔"

"ہاں! لے آؤ۔" وہ بولے۔

"فرزانہ دوسرے کمرے میں چلی گئی ..... سب کے دلوں کی دھڑکنیں حد درجے تیز ہو چلی تھیں مارے بے قراری کے ان کا بُرا حال تھا ..... اور پھر فرزانہ اندر داخل ہوئی ..... اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا ..... وہ اس نے پروفیسر صاحب کو دیا ..... انہوں نے پیکٹ کو کھولا ..... اس کے اندر موجود چیزوں کو دیکھا اور صدر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ امانت اب آپ کے حوالے ہے ..... اب آپ پوری دنیا کو بتائیں گے کہ انشارجہ کیا ہے ..... مسلمان دنیا کو ہی نہیں ..... باقی مذاہب کے ماننے والے ملکوں کو بھی معلوم ہو جانا چاہئے۔"

"شکریہ پروفیسر صاحب!" صدر صاحب نے پیکٹ لے لیا۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھ میں ایک ننھا سا پستول نظر آیا۔

"پروفیسر عمران جاہ رابل یہاں صرف پیکٹ حاصل کرنے نہیں ..... تمہیں جان سے مارنے بھی آیا تھا۔ پیکٹ میں حاصل کر چکا ..... اب تم بھی موت کو گلے لگالو۔"

"کیا جناب ..... یہ ..... یہ کیا؟" کمانڈر صاحب چلائے۔ باقی سب بھی بُری طرح اچھلے۔

"میں نے کہا تھا نا ..... کہ رابل آچکا ہے ..... دیکھ لیں ..... صدر صاحب کی صورت میں یہاں رابل موجود ہے ..... اور ..... براہِ راست انشارجہ سے چلا آ رہا ہے ..... اس سے پہلے تو یہ بذریعہ ٹرانسمیٹر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا رہا ہے۔

اور ذہنی جنگ لڑتا رہا ہے ..... ٹامی کا انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں آنا ..... اور جو کچھ بھی یہاں ہوا ..... وہ سب اسی کی پلاننگ تھی۔"

"نن ..... نہیں ..... نہیں۔" وہ چلا اٹھے۔

"اب چلانے سے کیا فائدہ ..... جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" رابل ہنسا۔

"تت ..... تو تم واقعی رابل ہو۔" کمانڈر صاحب بولے۔

"ہاں! اب تک یقین نہیں آیا کمانڈر ..... جب کہ میرے ہاتھ میں پستول موجود ہے اور میں اب پروفیسر عمران جاہ کو نشانہ بنانے چلا ہوں۔"

"ایک منٹ جناب ایک منٹ ..... انہیں نشانہ تو آپ بنائیں گے ہی ..... لیکن پہلے ایک دو باتیں تو کر لی جائیں۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے ..... مجھے واپس انشارجہ جانا ہے ..... میرا جہاز تیار کھڑا ہے ..... میں اس راز سمیت اپنے ملک چلا جاؤں گا ..... وہاں موجود آپ کے صدر صاحب کو تو حالات معلوم بھی نہیں ہیں ..... لہٰذا انہیں نہایت عزت اور احترام سے یہاں بھیج دیا جائے گا۔ آپ لوگ کس لئے مارے گئے ..... یہ انہیں معلوم نہیں ہو پائے گا ..... کیونکہ میں یہاں صرف پروفیسر عمران کو گولی کا نشانہ نہیں بنا رہا ..... آپ سب کو موت کے گھاٹ اتار کر جاؤں گا ..... تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔"

"ہوں! یہ تو کافی خوفناک پروگرام بن گیا ..... ہم تو اس خیال سے خوش ہو رہے تھے آپ صرف پروفیسر عمران جاہ کو گولی مار کر چلے جائیں گے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"کیا کہا ..... ہم خوش ہو رہے تھے ..... اتنا سفید جھوٹ تو نہ بولو۔" محمود نے اسے گھورا۔

"ایک تو تم درمیان میں ٹانگ اڑا بیٹھتے ہو۔" رابل نے خرا کر کہا۔

"مم ..... معاف کیجئے گا جناب ..... آپ تو اس وقت ویسے ہی موت کے گھاٹ اتارنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ..... ایسے میں آپ کو غصہ دلانا تو اور خطرناک ہو گا ..... کہیں آپ اپنا ارادہ نہ بدل دیں۔" فاروق نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا؟" فرزانہ جھلا کر بولی۔

"میرا خیال ہے ..... میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی ..... ہاں مسٹر رابل کا دماغ چل گیا ہے۔" فاروق نے نئی بات کہی۔

"تم نے کیا کہا ..... میرا دماغ چل گیا ہے۔"

ہاں! ..... اور میں نے غلط نہیں کہا۔" فاروق پُرسکون آواز میں بولا۔

"ذرا میں بھی تو سنوں ..... کیسے؟"

"مسٹر رابل یہ خیال کر رہے ہیں کہ یہ پروفیسر عمران جاہ کو آسانی سے نشانہ بنا سکتے ہیں .....

حالانکہ ایسا نہیں ہے....."

"تو پھر کیسا ہے..... تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟"

رابل نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"آپ کا نشانہ بہت کچا ہے مسٹر رابل..... اور یہ گولی کا وار بچانے کے بہت بڑے ماہر ہیں۔"

"پروفیسر عمران جاہ اور گولی کا وار بچانے کے ماہر..... کیا کہہ رہے ہو؟" مسٹر رابل نے جل بھن کر کہا۔

"اگر یقین نہیں تو فائر کر کے دیکھ لیں..... لیکن شرط صرف ایک ہے۔"

"یہ یہاں شرط کہاں سے ٹپک پڑی۔" رابل بولا۔

"شرط کے لئے ٹپک پڑنا کیا مشکل ہے..... ہاں تو شرط یہ ہے کہ آپ پے در پے فائر کریں گے ..... رکے بغیر۔"

"تم ضرور پاگل ہو گئے ہو۔" رابل نے بھنّا کر کہا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا..... پاگل میں نہیں ..... آپ ہونے والے ہیں۔"

"میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔"

"ابھی نہیں..... پہلے پروفیسر عمران جاہ۔" فاروق نے کانپ کر کہا۔

"تم نے مجھے غصہ دلا دیا ہے۔"

"یہ میری پرانی عادت ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"اچھا تو پھر یہ لو..... گئے تمہارے پروفیسر عمران جاہ۔" اس نے غرا کر کہا اور ٹریگر دبا دیا۔

فائر کی آواز گونج اٹھی..... ایک فائر کی نہیں..... پہلے فائر کے بعد مسلسل فائر ہوتے چلے گئے..... یہاں تک کہ پستول خالی ہو گیا.....

پروفیسر عمران جاہ اس دوران گویا ہوا میں اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ ان کی پھرتی قابل دید تھی۔ اس نے خالی پستول بھی ان پر کھینچ مارا..... جو دیوار پر لگا۔

"حیرت ہے..... کمال ہے۔" کمانڈر صاحب بولے۔

"جی..... اس میں حیرت اور کمال کی بات ابھی اور آئے گی۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اور کیا آئے گی ؟"

"بس دیکھتے جائیں۔"

"اور اب مسٹر رابل..... آپ کا کیا پروگرام ہے۔"

"پروفیسر عمران جاہ اس قدر پھرتیلے نہیں ہو سکتے..... نہیں ہو سکتے۔" رابل بڑبڑایا۔

"کیا زمانہ آگیا ہے..... آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے اور پھر بھی کہہ رہے ہیں..... نہیں ہو سکتے۔" "نہیں ہو سکتے..... تو کیا آپ اتنے پھرتیلے ہو سکتے ہیں۔" محمود نے جل بھن کر کہا۔

"ضرور کوئی گڑبڑ ہے..... کیا انہوں نے اپنے جسم پر بلٹ پروف لباس پہن رکھا ہے۔"

"نہیں تو۔"

"یقین نہیں آرہا۔"

"یقین دلا دیا جائے گا..... فکر نہ کریں..... ویسے ایک اور دھماکہ خیز بات بھی آپ کو بتا دیں۔"

"وہ کیا؟" رابل جلدی سے بولا۔

"یہ جو پیکٹ ہے نا..... آپ کے ہاتھ میں ..... یہ بھی اصل پیکٹ نہیں ہے۔"

"کیا!" وہ چلا اٹھا۔

"ہاں جی ..... یہ بالکل نقلی پیکٹ ہے ..... اصل کے مطابق بنایا گیا ہے ..... تاکہ دیکھنے میں اصلی ہی نظر آئے۔"

"اور اصل پیکٹ کہاں ہے؟"

"اس پیکٹ کو تم ہم اس عمارت میں لائے ہی نہیں تھے..... وہ وہیں ہمارے گھر میں ایک جگہ رکھا ہے۔ بالکل عام سی جگہ ..... جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تت..... تم لوگ بہت چالاک ہو..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا..... میں نے خیال کیا تھا..... نہایت آسانی سے یہ معرکہ مار لوں گا ..... افسوس۔"

"ویسے آپ نے ایک بات بالکل درست کہی تھی۔" فاروق بولا۔

"وہ کونسی بات۔؟"

"یہ کہ پروفیسر عمران جاہ اتنے پھرتیلے نہیں ہوسکتے..... نہیں ہوسکتے۔"

"میں نے یہ بات ٹھیک کہی تھی ناں۔" وہ

درخت جس کو خطوط آتے ہیں

جرمنی میں اکسٹھ (۶۱) سالہ کارل ڈیرنگ واحد ڈاکیا ہے جسے ہر روز ایک درخت پر چڑھ کر ڈاک تقسیم کرنا پڑتی ہے۔ اس کے علاقے میں محبوب اور محبوبہ کا ایک درخت پڑتا ہے اس درخت کے نام شوہر یا بیوی کے متلاشی لوگوں کے خطوط ہر روز آتے رہتے ہیں۔ کارل یہ خط درخت میں بنے ہوئے پندرہ فٹ کی بلندی پر ایک سوراخ میں ڈال دیتا ہے۔ ضرورت مند حضرات یہاں آتے ہیں اور مطلوبہ خط لے جاتے ہیں۔ ۱۸۰۰ء میں ڈیوک آف اولڈ برگ نے اس درخت کو ڈاک کے پتے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ جب سے اب تک بے شمار مرد و زن اس درخت کی وساطت سے اپنی شادی کرا چکے ہیں۔ اس درخت کے نام دنیا بھر کے مختلف ممالک سے مراسلات آتے ہیں اور اس کی زیارت کے لئے بھی دنیا بھر سے لوگ جاتے ہیں۔

مرسلہ:۔ عبدالستار خان طاہر، بوریوالہ

دو رنگ کا پھل

چین میں ایک ایسا پھل پایا جاتا ہے جو رات کو یا سایہ میں سفید اور دھوپ میں سرخ دکھائی دیتا ہے۔

موم بتی کی شکل کا درخت

پانامہ میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کی شکل موم بتی سے ملتی جلتی ہے۔ یہ چار فٹ کے قریب ہوتا ہے اور اس کے رس سے موم بتی بنتی ہے۔

مرسلہ..... یاسر بن نثار، راولپنڈی

چونکا۔

"ہاں! بالکل ٹھیک۔"

"تو پھر...... یہ اچانک اتنے پھرتیلے کس طرح بن گئے؟"

"ہم جانتے تھے...... آپ آکر پہلے پروفیسر صاحب کو ہی نشانہ بنائیں گے،...... لہٰذا ہم نے سوچا کہ آپ انہیں نشانہ نہ بنا سکیں...... اور آپ نہ بنا سکے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہ بات یہ ہوئی کہ اس وقت آپ کے سامنے جو صاحب پروفیسر عمران جاہ ہیں...... وہ دراصل پروفیسر عمران جاہ نہیں ہیں...... بالکل اسی طرح جس طرح آپ صدر نہیں ہیں۔"

معجزہ پھل

نائیجریا میں ایک پھل معجزہ پھل کے نام سے مشہور ہے۔ اس پھل کا اپنا کوئی ذائقہ نہیں لیکن اسے کھانے کے بعد دوسری چیزوں کے ذائقے میں عجیب و غریب تبدیلیاں پیدا ہو جاتیں ہیں مثلاً معجزہ پھل کھانے کے بعد اگر ترش لیموں کھائیں تو یہ موسمی کی طرح میٹھا معلوم ہوگا۔

مرسلہ...... یاسر بن نثار، راولپنڈی

"تو پھر...... یہ کون ہیں؟"

"انسپکٹر جمشید۔"

"کیا!!"

وہ بلند آواز میں چلا اٹھا۔

(پھر کیا ہوا۔ آئندہ شمارے میں پڑھئے)

بچوں کے مشہور و معروف مصنف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۵۶۶ ـــ موت کا سفر ـــ انسپکٹر جمشید سیریز ـــ ۱۰ روپے
۵۶۷ ـــ جان لیوا مخلوق ـــ " ـــ ۱۰ "
۵۶۸ ـــ منصوبہ ساز ـــ " ـــ ۱۰ "
۵۶۹ ـــ خوف کی قید ـــ " ـــ ۱۰ "
۳۷ ـــ خوف ناک مکان ـــ " ـــ ۱۰ "
۳۸ ـــ مجرم کا خوف ـــ " ـــ ۱۰ "
۱۴ ـــ تیسرا رخ ـــ انسپکٹر کامران مرزا سیریز ـــ ۱۰
۵ ـــ پانچ پیسے کا کیس ـــ شوکی سیریز ـــ ۱۰ "

۲۰ مارچ ۱۹۹۶ء

کو آپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب

یا

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانڈہ کلاں لاہور، ـــ فون ۷۲۴۶۳۵۶

قلم دوست

ان کی تحریریں جواد یب بننا چاہتے ہیں

سب اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں!

مرسلہ: محمد سلیم امام

اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے۔ یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن سے آ سکتی ہے۔ سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

(۳۶ یٰسین ۳۸ تا ۴۰)

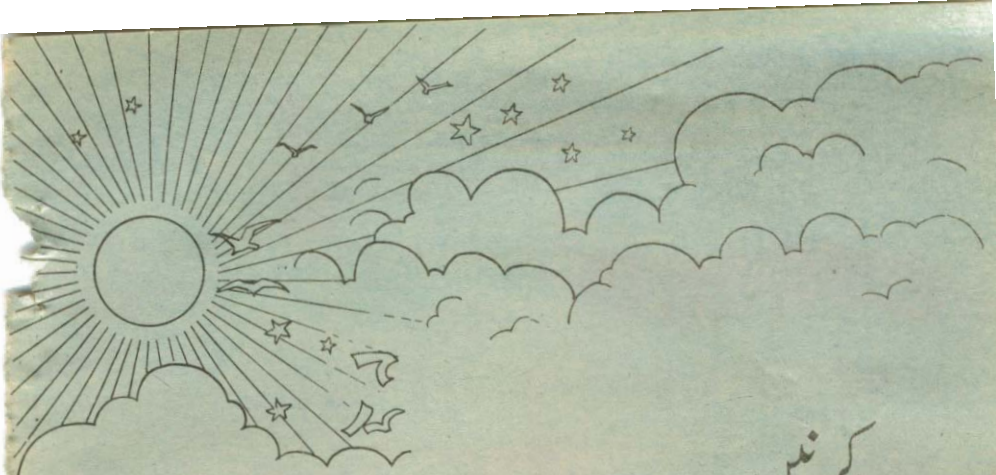

کرنیں

حضرت علیؓ کو شان و شوکت کی زندگی سے سخت نفرت تھی۔ آپ محنت مشقت کر کے روزی کماتے اور سیدھی سادی زندگی بسر کرتے۔ جب آپ مسلمانوں کے خلیفہ ہو گئے تب بھی آپ کی سادگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایران مصر، شام اور عراق جیسے ملک اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکے تھے مگر اتنی بڑی سلطنت کے حاکم بن کر بھی حضرت علیؓ نے نہ کوئی محل بنوایا اور نہ خدمت کے لئے نوکر چاکروں کی فوج رکھی۔

ایک سال عید نزدیک آئی تو حضرت علیؓ اپنے خادم کو ساتھ لے کر بازار گئے اور دو جوڑے خریدے ایک جوڑا معمولی کپڑے کا تھا اور دوسرا ذرا اچھے کپڑے کا۔

عید کی صبح کو خادم نے نہا دھو کر وہ جوڑا پہن لیا جو معمولی کپڑے کا تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے دیکھا تو کہا۔

"تم نے ہمارا لباس کیوں پہنا؟"

خادم نے جواب دیا۔ "یا حضرت، میں نے تو اپنے ہی کپڑے پہنے ہیں کیونکہ یہ معمولی کپڑے کا جوڑا ہے۔"

حضرت علیؓ بولے۔ "یہ معمولی کپڑے کا جوڑا ہم نے اپنے لئے خریدا تھا۔ تیرا جوڑا وہ ہے جو بڑھیا کپڑے کا ہے تو وہ پہن کیونکہ تو جوان ہے اور ہم بوڑھے۔"

شاہد خلیل احمد، کراچی۔

بلاعنوان

آصف اقبال

عید میں کچھ ہی روز باقی رہ گئے تھے اور جمال خاصا فکر مند تھا۔ اس کے بچوں نے اس عید پر نئے کپڑوں کی فرمائش کی تھی اور کہہ دیا تھا کہ وہ اس عید پر پرانے کپڑے نہیں پہنیں گے۔

جمال ایک دفتر میں کلرک تھا۔ اس کی تنخواہ سترہ سو تھی اور آٹھ بچے تھے اگر وہ عید پر بچوں کے نئے کپڑے بنا دیتا تو پھر گھر کی گاڑی کس طرح چلتی۔ جب کہ بچوں نے پرانے کپڑے نہ پہننے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔

رمضان میں دفتر کی چھٹی تین بجے سہ پہر تک ہو جاتی تھی۔ جمال بس میں دفتر سے واپس گھر آرہا تھا کہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر بس خراب ہو گئی۔ لوگ بس سے اُترے اور ڈرائیور کو بکتے جھکتے اپنے گھروں کو پیدل ہی روانہ ہوئے۔ جمال بھی بس سے اُترا اور پیدل گھر کو روانہ ہوا۔ گھر تک پہنچنے کے لئے اس نے "شارٹ کٹ" اختیار کیا جو قبرستان سے ہو کر جاتا تھا۔ وہ قبروں کے درمیان سے سوچ و بچار میں گم گزر رہا تھا کہ ایک تازہ قبر کو دیکھ کر اس کے قدم رُک گئے۔ اس نے چور

نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قبرستان میں ہُو کا عالم تھا۔ دور دور تک آدم نہ کوئی آدم زاد نظر آتا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اس کے علاوہ وہاں کوئی اور موجود نہیں، جمال نے ہاتھوں سے کچی قبر کی مٹی ہٹانی شروع کر دی۔ وہ یہ کام بڑی جلدی جلدی کر رہا تھا۔ جب مٹی ہٹ گئی تو اس نے سیمنٹ کے بنے ہوئے بلاک نکال لئے اور قبر میں اُتر گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جب وہ قبر سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں مُردے کا سفید کفن تھا۔ بڑی جلدی جلدی اس نے بلاک واپس لگائے، قبر کی مٹی برابر کی پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا کفن بغل میں دبائے قبرستان سے باہر نکل آیا۔ اب اس کے قدم بڑی تیزی سے گھر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل دفتر سے واپسی پر وہ اسی "شارٹ کٹ" راستے سے آئے گا اور اگر روز ایک تازہ قبر اسے ملتی رہی تو اس عید پر اس کے بچے بھی نئے کپڑے پہن سکیں گے.....!!

کہانی یہاں پر ختم ہو گئی تھی..... !! رات کے کوئی دو بجے لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بچہ جاگ رہا تھا۔ اس نے زور سے ایک انگڑائی لی اور کہانی کی کتاب ایک طرف ڈال دی پھر اس نے لالٹین کی مدھم روشنی میں اپنے چھ بہن بھائیوں کا جائزہ لیا جو ایک ہی رضائی میں ایک دوسرے سے چمٹ کر سو رہے تھے..... وہ کچھ دیر تک اپنے بہن بھائیوں کو دیکھتا رہا پھر اس کی نگاہیں اپنے ابو کی طرف اُٹھ گئیں جو آٹے کی دھلی ہوئی بوری اوڑھے سکڑے سمٹے بے خبر سو رہے تھے۔ اس بچے کے ابو بھی کلرک تھے اور اس عید پر اس کے تمام بہن بھائیوں نے بھی ان سے نئے کپڑوں کی فرمائش کی تھی۔

بچہ سوچنے لگا اگر ابو دفتر سے واپسی پر وہی قبرستان والا شارٹ کٹ راستہ اختیار کریں تو اس عید پر ان کے بھی نئے کپڑے بن سکتے ہیں.....!!!

جو اچھے بچے ہوتے ہیں
وہ جب بھی رات کو سوتے ہیں
تو چاند کی پریاں آتی ہیں
اور ان کو ساتھ لے جاتی ہیں
چاند کی سیر کراتی ہیں
اور دل ان کا بہلاتی ہیں
تو اچھے بچے بن جاؤ
اور چاند کی سیر کو تم جاؤ

مجھ کو پڑھنا لکھنا ہے
سب سے آگے بڑھنا ہے

میں پاؤں سے معذور ہوں تو کیا
میرا ذہن تو معذور نہیں

ایک خوشبودار پودا

شائستہ مومن

ریحان سے ہماری ملاقات ایک تقریب میں ہوئی۔ وہ اپنے ابو جان کے ساتھ الگ تھلگ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم ان کے قریب جا بیٹھے پھر ان کے کان کے قریب جُھکتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی! آپ کو معلوم ہے یہ کھانا کب کُھلے گا؟"

"کیوں انکل! بہت بھوک لگ رہی ہے؟"

ریحان بولے تو ہم نے ادھر ادھر دیکھا پھر چُپکے سے ریحان کے کان میں کہا۔

"بھئی! جب ہم کسی دعوت میں جاتے ہیں تو صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے ہیں!!"

"پھر تو لگتا ہے آج آپ کا "دیگ" کھانے کا پروگرام ہے۔"

یہ سُن کر ہم ہنس پڑے اور ریحان بھی۔ خیر یہ تو مذاق کی بات ہوئی ہم یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ ریحان ایک حوصلہ مند اور محنتی بچے ہیں۔ جب وہ

گڈو اور گڑیا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔

چھ ماہ کے تھے تو پولیو کا شکار ہو گئے لیکن ان کے والدین نے ان پر شفقت، محبت اور خصوصی توجہ کے دروازے وا رکھے جس کی وجہ سے انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں کہ وہ چل پھر نہیں سکتے۔ ریحان کا اب بھی باقاعدگی سے علاج ہو رہا ہے۔ ریحان گرین ہوم پبلک اسکول لیاقت آباد کراچی میں چوتھی جماعت کے طالب علم ہیں۔ ان کا شمار ذہین بچوں میں ہوتا ہے۔ وہ پہلی جماعت سے اوّل آ رہے ہیں۔

ریحان کا اسکول آٹھ بجے لگتا ہے اور وہ صبح سات بجے اُٹھ جاتے ہیں۔ باتھ روم سے فارغ ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھوتے اور ٹوتھ پیسٹ کرتے ہیں۔ امی ابو ان کی ہلکی پھلکی سی مدد کرتے ہیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد یونیفارم پہن کر ابو کے ساتھ اسکول چلے جاتے ہیں۔ چھٹی میں کوئی بھی گھر کا فرد انہیں اسکول سے لے آتا ہے۔ ریحان پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ ناظرہ قرآن میں پانچواں پارہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ہماری ان سے اصل بات چیت ان کے گھر پر ہوئی۔

س: سُنا ہے آپ پہلی جماعت سے اوّل آ رہے ہیں۔ کیا آپ کے نانا کا اسکول ہے؟

ریحان: جی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں جو محنت کرتا ہے وہ اوّل تو آتا ہی ہے۔

س: لیکن ہم تو کبھی اول نہیں آئے۔ محنت تو ہم نے بھی کی تھی! اس کی وجہ؟

ریحان : آپ نے بہت زیادہ محنت نہیں کی ہوگی انکل! اوّل آنے کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے، بہت زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔

س :اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ کو اس مقام تک لانے میں کن کن لوگوں نے آپ کی مدد کی؟

ریحان :امی ابو نے، وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور مجھ پر خصوصی توجہ رکھتے ہیں ان کی محبتیں پا کر مجھے کسی کمی کا احساس نہیں۔ ہر قدم پر انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

س :یہ تو آپ نے بڑی اچھی بات بتائی ورنہ ہم جب چھوٹے سے تھے تو ہمارے امی ابو ہماری بڑی پٹائی لگاتے تھے...... آپ کی کبھی لگی پٹائی؟

ریحان : (ہنستے ہوئے) جو امی ابو کو تنگ کرے گا تو پٹائی تو ہوگی ہم اپنے امی ابو کو تنگ نہیں کرتے ہیں یعنی ہم آپ کی طرح نہیں ہیں۔

س :ارے بھائی! آپ تو ہماری پول کھولنے بیٹھ گئے۔ آپ یہ بتائیں کہ اسکول میں کون کون سے استاد آپ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے ہیں؟

ریحان :تقریباً سب ہی۔

س :اچھا اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کے پسندیدہ مضامین کون کون سے ہیں؟

ریحان :انگلش اور حساب۔

س :باپ رے باپ ...... ہمیں تو ان سے بہت خوف آتا ہے آپ کو ڈر نہیں لگتا؟

ریحان :جو لوگ ڈرتے ہیں وہ کبھی ترقی نہیں

میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں
پر کام کروں گا بڑے بڑے

کرتے۔ آپ تو بڑے ڈرپوک ہیں انکل!

س :اچھا اب ڈرائیں ناں ہمیں، یہ بتائیں پڑھنے لکھنے کے علاوہ فارغ اوقات میں آپ کیا کرتے ہیں؟

ریحان :میں ڈرائنگ بناتا ہوں اور کہانیاں پڑھتا ہوں۔

س :کس قسم کی کہانیاں آپ کو اچھی لگتی ہیں؟

ریحان :جسے پڑھ کر بہت ہنسی آئے اور جس میں کوئی پیغام بھی ہو۔

س :اچھا بھئی! کھیل کھیلتے ہیں آپ، کون کون سے؟

ریحان : کیرم اور کرکٹ لیکن گھر میں کھیلتا ہوں بہن بھائیوں کے ساتھ۔

س :کرکٹ میں آپ کے پسندیدہ کھلاڑی کون کون

سے ہیں؟

ریحان: جاوید میاں داد اور انضمام الحق۔

س: ٹی وی دیکھتے ہیں آپ؟

ریحان: جی ہاں!

س: کون کون سے پروگرام آپ کو اچھے لگتے ہیں؟

ریحان: کارٹون اور ..... اور عینک والا جن اور اس میں جو کردار ہیں نسطور، زکوٹا اور عمرو عیار۔ یہ مجھے بے حد پسند ہیں۔ اس ڈرامے کو دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور خوشی بھی ملتی ہے۔

س: لیکن بھئی! ہمیں تو جنوں سے بہت ڈر لگتا ہے خاص کر اس ڈرامے میں جو چڑیل ہے، کیا نام ہے اس کا "بتوڑی" اس سے تو ہمیں خوف آتا ہے ہم تو سوچ رہے ہیں کہ اس ڈرامے کے پروڈیوسر کو خط لکھیں کہ وہ بچوں کو ڈرانے والا یہ ڈرامہ بند کریں۔ آپ راضی ہیں ہماری اس بات سے؟

ریحان: بالکل نہیں! یہ ڈرامہ تو بچوں کے لئے بہت اچھا ہے۔

س: اچھا بھئی! ہم سمجھ گئے کہ بچوں کو خوش رکھنے کے لئے ایسے ڈرامے ہونے چاہئیں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے؟ ویسے ہم تو آپ کو بتا رہے ہیں ہم بڑے ہو کر دولہا بنیں گے۔ آپ کا بھی ایسا ہی کوئی پروگرام ہے؟

ریحان: (ہنستے ہوئے) جی نہیں! ابھی تو میں بہت چھوٹا ہوں۔ پڑھ لکھ کر میں ڈاکٹر بنوں گا۔

س: اور ڈاکٹر بن کر آپ خوب پیسے کمائیں گے خاص کر غریبوں سے؟

ریحان: جی نہیں! غریبوں کا تو میں مفت علاج کروں گا۔

س: اچھا ریحان! ایک بات تو آپ نے بتائی ہی نہیں!؟

ریحان: کون سی انکل؟

س: یہی کہ آپ کے نام کے کیا معنی ہیں؟

ریحان: سوری انکل! مجھے نہیں معلوم .....!

س: چلیں ہم آپ کو بتاتے ہیں ..... آپ کے نام کا مطلب ہے "ایک خوشبو دار پودا"

اتنا کہہ کر ہم نے ریحان کو پیار کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اللہ انہیں واقعی علم و ہنر کا خوشبو دار پودا بنائیں اور وہ اپنی گھنی چھاؤں میں دکھی انسانیت کو پناہ دے سکیں۔ آمین! ○ ..... ○

ماں کی خدمت

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسولؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "حضورؐ مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے کیا اللہ میری توبہ قبول کر کے میرے گناہ معاف کر دے گا؟" آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ "تیری ماں زندہ ہے؟" اس نے نفی میں جواب دیا پھر دریافت کیا "خالہ زندہ ہے؟" اس نے کہا "ہاں!" رسولؐ نے فرمایا۔ "واپس جا اور اپنی خالہ کی خدمت کر۔"

مرسلہ عمران خالق، کراچی

کیسی رہی

اے اے حسن

"ظاہر ہے بغیر یونیفارم کے میں اسکول جا ہی نہیں سکتا۔"

"اچھا بابا! ٹھیک ہے چھٹی کر لو۔" امی نے کہا تو ہم عمر کو لے کر کھیلنے کودنے نکل گئے۔ بس جی پھر تو وہ وہ کھیل کھیلے کے مزا ہی آ گیا۔ ویسے ہم نے محسوس کیا ہے کہ چھٹی کر کے کھیلنے میں کچھ زیادہ ہی مزا آتا ہے۔ آپ نہیں کریں گے کبھی چھٹی۔ کھیل ہی کھیل میں پھر وہ ہو گیا جو ہمارے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ کھیل نے اپنی ہیئت تبدیل کر لی اور لڑائی کی شکل اختیار کر گیا۔ اس لڑائی کا دلن شکیل تھا۔ (صرف نام کا) اس نے ہمیں، ہمارے آباو اجداد کی یادِ گم گشتہ دلا دی۔ اب کیا تھا ہم نے اس کا گریبان پکڑ لیا لیکن وہ طاقت میں ہم سے زیادہ ہے۔ اس نے ہماری خوب مار لگائی۔ جیسے "ریسلنگ" میں کمزور پہلوانوں کی لگتی ہے۔ یہ لڑائی یکطرفہ رہی اور گھر آ کر ہم انتقام لینے کی ترکیبیں سوچنے لگے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک مرتبہ پھر دماغ کے

بجائے خواب نے ہماری رہنمائی کی۔ جی ہاں دوپہر کو سوئے تو ایک عدد خواب اپنی انتقامی ترکیب کے ساتھ ہمارے دماغ پر دستک دے رہا تھا۔ ہم سو کر اٹھے تو عمر سے کہا۔ یار! پولیس کو فون کرو۔ "کیا؟" عمر کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

آج بھی جب میں وہ دن یاد کرتا ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ میں میٹرک کا طالب علم تھا اور خاصا شرارتی بھی۔ عمر میرا ہم عمر کزن ہے۔ ان دنوں شہر میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ اسی دوران ان کے علاقے میں کرفیو لگ گیا۔ چنانچہ کرفیو والی رات وہ ہمارے گھر رہنے آ گیا۔ اس کے آنے سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ رات کو ہم سونے لیٹے تو میں صبح اسکول سے چھٹی کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ تاکہ کزن کے ساتھ کل جی بھر کر مزے کئے جائیں۔ آدھے گھنٹے تک دماغ کو غوطے دیتا رہا مگر چھٹی کرنے کی کوئی خاص الخاص ترکیب ذہن میں نہ آئی۔ (بہانہ بھی کوئی سوجھ نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی عام بہانے امی مانتی ہی نہ تھیں) ترکیبیں سوچتے سوچتے نیند کی آمد ہو گئی۔ رات کسی پہر خواب میں دیکھا کہ یونی فارم دھو کر لٹکا رہے ہیں۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ میں سوچنے لگا کہ خواب میں کیا دیکھا ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں جو ترکیب جاگتے میں کسی طرح نہ سوجھ رہی تھی وہ اس خواب نے سجھا دی تھی۔ (وہ خواب ہماری زندگی کے عظیم خوابوں میں سے ایک تھا)

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ میں تیزی سے اٹھا اور اپنے "خوابی منصوبے" پر عمل پیرا ہونے لگا۔ یونیفارم جو صحن میں دھلا سوکھ رہا تھا۔ اسے خوب خوب گیلا کیا اور بغیر نچوڑے پھیلا دیا۔ اس کے بعد میں اطمینان سے آکر سو گیا۔ صبح ساڑھے چھ بجے امی نے اٹھایا تو آرام سے سارے کام کئے (فالتو کام زیادہ کئے) پھر حسبِ منصوبہ صحن میں جا کر ایک زور دار چیخ ماری۔ "ارے! یہ میرا یونیفارم تو ابھی تک نہیں سوکھا۔ اب کیا ہوگا؟"

"کیا!" امی حیران پریشان صحن میں آئیں اور بے یقینی سے دیکھنے لگیں کیونکہ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ "واقعی یہ تو بالکل گیلا ہو رہا ہے۔" امی بے چاری اپنا قصور سمجھ رہی تھیں۔

"تت..... تت.....! تم نے شکیل کو قتل تو نہیں کر دیا۔"

(باقی آئندہ)

ماہ فروری ۱۹۹۴ء کے شرارت نمبر میں شامل صفیان علی شیخ کی تحریر "بارش ابا جان اور میں" نقل شدہ تھی۔ لہٰذا مذکورہ مصنف کو بلیک بکس کیا جاتا ہے۔ آئندہ آنکھ مچولی میں ان کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوگی۔ ثبوت فراہم کرنے پر ہم گجرات کی عروسہ وحید کے ممنون ہیں۔ (ادارہ)

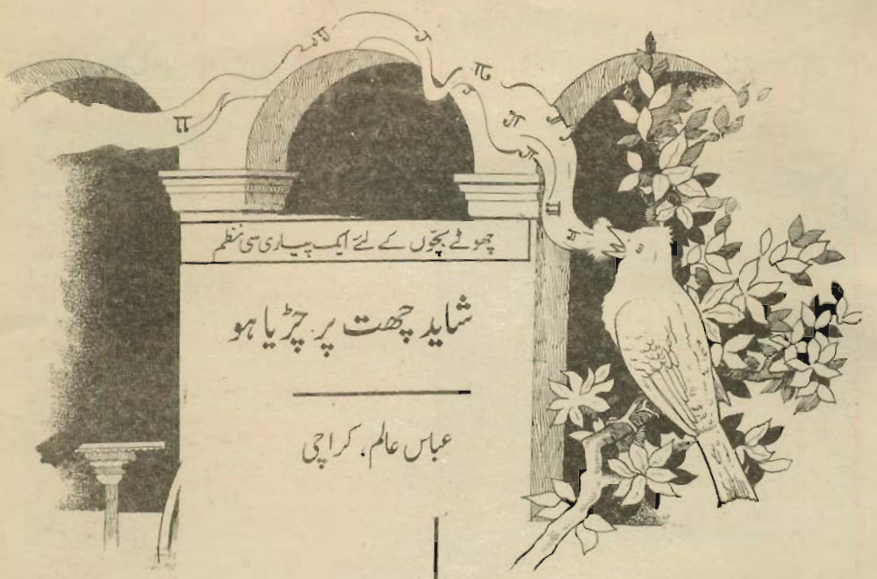

چھوٹے بچّوں کے لئے ایک پیاری سی نظم

شاید چھت پر چڑیا ہو

عباس عالم، کراچی

چلئے چھت پر چلتے ہیں
شاید چھت پر بادل ہوں
شاید چھت پر بارش ہو
شاید چھت پر چڑیا ہو
بھیگی سہمی بیٹھی ہو
چُپکے چُپکے روتی ہو
اس کو نیچے لائیں گے
اور اس کو سمجھائیں گے
دیکھو جب بھی بارش ہو
اپنے گھر میں رہتے ہیں
رام کہانی کہتے ہیں

جب اس کے پر سُوکھیں گے
چڑیا اپنے گھر جائے!
اور ہم بھی خوش ہو جائیں
گر یہ سب کچھ ہو جائے
سب کچھ کتنا اچھا ہو
لیکن سب سے پہلے تو
چلئے چھت پر چلتے ہیں
شاید چھت پر بادل ہوں
شاید چھت پر بارش ہو
شاید چھت پر چڑیا ہو

پیسا کا ٹاور

ظفر حسین فریالی

اٹلی کے شہر پیسا میں واقع پیسا ٹاور ۷۹ فٹ بلند ہے۔ اسی طرح یہ قطب مینار، فرانس کے ایفل ٹاور اور نیو یارک کی امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے مقابلے میں تو پست قد ہے لیکن اپنی عجیب و غریب فنِ تعمیر اور دلکشی کی وجہ سے دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک تصوّر کیا جاتا ہے۔ اٹلی کا شہر پیسا نامی صوبے کا صدرِ مقام ہے۔ یہ بحیرہ روم سے صرف ۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پیسا کے مینار کی تعمیر ۱۱۷۴ء میں "بوفانا" نامی معمار نے گھنٹہ گھر کی حیثیت سے شروع کی لیکن یہ مختلف مدارج سے گزرتا ہوا تقریباً ۱۷۴ سال بعد ۱۳۵۰ء میں تکمیل کو پہنچا۔ جس جگہ اس کی تعمیر ہوئی تھی وہ جگہ دلدلی تھی جس کی وجہ سے مینار بتدریج جُھکتا چلا جا رہا تھا حالانکہ ابھی اس کی تین منزلیں ہی بنی تھیں مگر اپنی جگہ مستحکم کھڑا ہے۔ ۱۸۲۹ء میں اس کی پیمائش کی گئی تو یہ عجیب و غریب مینار ساڑھے پندرہ فٹ ایک جانب سے جُھک گیا تھا۔ یہ ٹاور ۲۳ نومبر ۱۹۸۰ء کو شدید ترین زلزلے کے باعث ۲۲ فٹ تک لرزتا اور جھولتا رہا۔ زلزلے کے خاتمے پر ٹاور اسی مستحکم مقام پر آ گیا۔ جہاں وہ پہلے تھا۔ ○ ..... ○

ہمارا دیس

اسما اصغر، راولپنڈی

یہ دیس ہے ہمارا
اِسلام کا گہوارہ
سچّائی کی علامت
اس کی کریں حفاظت
اس لئے جئیں گے
اس کے لئے مریں گے
غدّاری جو کرے گا
بے موت وہ مرے گا
یہ عہد ہم کریں گے
رشوت سے ہم بچیں گے
یہ امن کا نشاں ہے
قربان اس پہ جاں ہے

وہ وقت پھر آئے گا

تابندہ زہرہ، راولپنڈی

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک کنال کی بڑی سی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں موجود ایک بوڑھا سردی سے کپکپا رہا تھا "اس بڑی سی کوٹھی میں رہنے والے لوگوں کے دل کتنے چھوٹے ہیں۔" اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ اب اس کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ مزید سردی برداشت کرتا۔ چائے کی طلب بڑھتی جا رہی تھی مجبوراً وہ کچن کی جانب بڑھا لیکن باورچی خانے کی تمام الماریوں میں تالے لگے ہوئے تھے۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آگیا اور پھٹا پرانا کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ وہ اپنی بیوی اور ننھے منے اکلوتے بچے کے ساتھ اپنے چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ اس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور ایک ایسی ہی تاریک اور سرد رات میں زندگی کی بازی ہار گئی۔ بیوی کی موت کے بعد اس نے اپنے بیٹے کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ باپ تو اس کا وہ تھا ہی۔ اپنی مشفقانہ تربیت سے اس نے ماں کی کمی بھی پوری کر دی۔ وہ ایک چھوٹے سے سرکاری اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنے بیٹے کو تعلیم دلائی۔ آخر اس کی محنت رنگ لائی۔ اس کے بیٹے نے CSS کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کر لیا اور ایک محکمے میں افسر لگ گیا۔ اس کے بیٹے کی شادی بھی ایک بڑے مالدار خاندان میں ہو گئی مگر اس کے بیٹے نے اس کی تمام زندگی کی محنت کا یہ صلہ دیا کہ وہ آج سرونٹ کوارٹر میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

ہوا کے سرد جھونکے اسے ماضی سے کھینچ لائے تو اس نے اپنے آپ کو کمبل میں چھپا لیا مگر سردی اس کے بوڑھے جسم میں گھسی جا رہی تھی۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھل

گئی۔ پانی کی بوندیں اس کے اوپر پڑ رہی تھیں چھت کے سوراخوں میں سے پانی آرہا تھا اور پھر ایک دھماکہ ہوا سرونٹ کوارٹر کی کمزور چھت گر پڑی تھی۔ دو تین روز کے بعد سرونٹ کوارٹر کی تعمیر پھر سے شروع ہوئی۔ رشید نے اپنے باپ کی بڑی شاندار قبر بنوائی، غریبوں کو کھانا کھلوایا، قرآن خوانی کا اہتمام کیا اور رویا دھویا اور باپ کو یاد بھی کیا لیکن دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی پھر پرانے ڈھب پر آگئی۔ رشید بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی دن گزارنے لگا ہے لیکن اسے شاید معلوم نہیں کہ اس نے جیسا باپ کے ساتھ کیا ہے ایک دن ویسا ہی اس کے اولاد اس کے ساتھ کرے گی۔ دنیا مکافات کا گھر ہے۔ آدمی کسی کے ساتھ جو کرتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ کبھی بھی پیش آسکتا ہے۔

○ ..... ○

بلا عنوان

حسنہ چانڈیو، کراچی

اس بار حسنہ چانڈیو اور آصف اقبال کی خوبصورت بلا عنوان کہانیاں پیش کی جارہی ہیں جن کا عنوان آپ نے منتخب کرنا ہے۔ بہترین عنوان منتخب کرنے والے چھ ساتھیوں میں آنکھ مچولی کے تاز ہ شمارے اعزازی ارسال کئے جائیں گے۔

اپنے عنوانات درج ذیل پتے پر ۱۰ مارچ تک ارسال کر دیجئے۔

انچارج قلم دوست ماہنامہ آنکھ مچولی ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی۔

شکیل ایک گونگا لڑکا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ اپنا کام وہ نہایت ایمانداری اور فرض شناسی سے کرتا۔

ایک روز جب وہ میزیں صاف کر رہا تھا تو اس

نے کالے رنگ کا بٹوہ میز پر پڑا دیکھا۔ شکیل نے بٹوہ اٹھالیا اور ہوٹل کے مالک کو دے دیا۔ ہوٹل کے مالک نے بٹوہ کھول کر دیکھا تو اس میں ہزار ہزار کے کئی نوٹ جھانک رہے تھے۔ مالک کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بٹوہ جیب میں ڈالا اور شکیل سے کہا۔

"جاؤ! تم کام کرو۔"

شکیل اپنے کام میں لگ گیا۔ دوسرے دن بٹوے کا مالک پوچھتے پوچھتے ہوٹل میں آ گیا۔ اس نے شکیل سے بٹوے کے متعلق پوچھا تو شکیل نے اشاروں سے بتایا کہ بٹوہ اسے ملا تھا اور وہ اس نے ہوٹل کے مالک کو دے دیا ہے۔

بٹوے کا مالک ہوٹل والے کے پاس پہنچا اور بتایا کہ وہ انسپکٹر خالد ہے اور کل شام وہ اپنا بٹوہ میز پر بھول گیا تھا۔ ہوٹل والے نے دیکھ لیا تھا کہ شکیل نے اشاروں میں بتا دیا ہے کہ بٹوہ اس کے پاس ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً بٹوہ نکال کر انسپکٹر کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ انسپکٹر نے بٹوہ کھول کر پیسے گنے۔ ایک ہزار کا ایک نوٹ کم تھا۔

"اس میں ایک نوٹ کم ہے۔" اس نے کہا۔

"جناب! مجھے کیا معلوم؟ مجھے تو یہ بٹوہ میرے ملازم نے دیا تھا۔ یقیناً آپ کا نوٹ اسی نے نکالا ہوگا۔" ہوٹل والے نے جلدی سے کہا۔

"میں نے بڑے بڑے چور بدمعاش ٹھیک کر دیئے ہیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر نے شکیل کا کان پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔

شکیل روتا دھوتا گھسیٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے اور شکیل کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ہوٹل کا مالک بھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس ظالم نے اپنی گردن کا پھندا ننھے بچے کے سر ڈال دیا تھا!!

○ ..... ○

خاموشی

○ ـــــ خاموشی میں بہت بڑی حکمت عملی ہے۔ (حضورؐ)

○ ـــــ خاموشی عالم کے لئے زیور اور جاہل کے لئے پردہ ہے۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ ..... وسیم خان، حیدر آباد

سنہری باتیں

○ ـــ لوگوں سے ملو تو اخلاق کی بنا پر اور کٹو تو اعمال کی وجہ سے۔

○ ـــ غیبت سننے والا غیبت کرنے والوں میں شامل ہے۔

○ ـــ گناہ کسی نہ کسی صورت دل کو بے چین رکھتا ہے۔

○ ـــ دشمن کو مہربانی، احسان سے اور دوست کو نیک سلوک سے جیتو۔

مرسلہ ..... افتخار عالم، کراچی۔

آخری بات

نعمان مقصود قائم خانی

کوشش کرنا انسان کا کام ہے اور کامیابی دینا اللہ تعالیٰ کے ذمے۔

ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہونا چاہئے کہ انسان کسی بھی اچھے مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ضرور نوازتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے پاک وطن کے حصول کے لئے ۲۳ مارچ کو اقبال پارک میں عہد کیا اور پھر اس کے حصول کی کوشش شروع کر دی۔ اس کے لئے خوب محنت اور جدوجہد کی۔ چونکہ یہ کوشش ایک اسلامی اور نظریاتی ملک کے قیام کے لئے تھی اور یہ ایک نیک مقصد تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ۲۷ رمضان المبارک کی شب میں مسلمانوں کو ایک عظیم الشان کامیابی عطا فرمائی اور ایک آزاد اسلامی ریاست اور پاک وطن "پاکستان" وجود میں آیا۔

اچھی کوشش کا صلہ اچھا ملتا ہے۔ اب ہمیں پاکستان کو صحیح معنوں میں نظریۂ پاکستان کے مطابق ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بنانے کی بھرپور کوششیں کرنی ہوگی اور ان لوگوں کے شانہ بشانہ چلنا ہوگا جو پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست اور عالم اسلام کا مرکز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں..... !!!

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

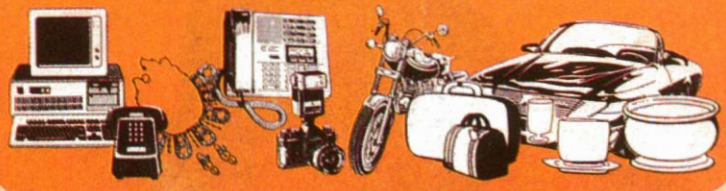

ELFY
ایلفی
ہر چیز سیکنڈوں میں جوڑے
انتہائی طاقتور
ایلفی سلوشن
ELFY BONDS
ELFY
SETS IN SECONDS
BONDS ALMOST ANY THING
UPTO 2 TONS HOLDING POWER
CONTENTS : MADE IN JAPAN-PACKED IN SWAT
ایلفی کے جوڑ دو ٹن سے زائد قوت برداشت کرتے ہیں

REGD. No. M-266 MARCH 1994
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

LASER DOT